مارچ ۱۹۹۰ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل ("صدق اللہ العظیم")	عاکف سعید	۲
ہدایت القرآن (۳۶)	مولانا محمد تقی امینی	۵
شہادت سے مطلوب و مقصودِ مومن	مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی	۱۲
تدوینِ قرآن پر اعتراضات	سید شبیر حسین شاہ زاہد	۲۳
حکمتِ اقبال (۲۱)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۲
لغات و اعرابِ قرآن (۱۰)	پروفیسر حافظ احمد یار	۳۷
کراچی میں قرآن اکیڈمی کا قیام اور شامِ الہدیٰ	مرتب: رحیم کاشفی	۵۴
اسلام کا سیاسی نظام (بسلسلہ ڈاکٹر طاہر سعید کے نام)	ڈاکٹر حافظ محمد مقصود	۶۱

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

پروگرام محاضراتِ قرآنی

۱۹ تا ۲۱ مارچ روزانہ بعد نمازِ مغرب

موضوع

دعوت رجوع الی القرآن

اس سال کوشش ہوگی کہ صرف تحریری مقالات ہی پیش کیے جائیں!

مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی:

- مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی)
- ڈاکٹر برہان احمد فاروقی
- پروفیسر محمد سعید شیخ
- ڈاکٹر ظہور احمد اظہر
- مولانا الطاف الرحمٰن بنوی
- پروفیسر اختر الحسن بھٹی
- پروفیسر حافظ محمد فاضل
- چوہدری مظفر حسین
- جناب عبدالکریم عابد
- مولانا محمد طاسین (کراچی)
- پروفیسر نجتیار حسین صدیقی
- ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
- ڈاکٹر عبدالخالق
- مولانا سعید الرحمٰن علوی
- مولانا محمد اسحٰق بھٹی
- پروفیسر حافظ نذر احمد
- جناب جعفر قاسمی
- ڈاکٹر اسرار احمد، اور
- علامہ سید غلام شبیر بخاری
- ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک
- پروفیسر محمد اسلم
- پروفیسر غازی احمد
- ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ
- پروفیسر حافظ احمد یار
- میاں عبدالرشید
- ڈاکٹر ابصار احمد

نوٹ: مسلسل تین دن ابتدا ہی سے شرکت فرمانے والے حضرات کو محاضرات کے موضوع پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقریباً تین صد صفحات پر مشتمل تالیف بلاقیمت ہدیہ کی جائے گی!

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

قرآن اکیڈمی لائبریری
36-کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

معاون امور انتظامی: حافظ خالد محمود خضر

جلد: ۹ — مارچ ۱۹۹۰ء مطابق شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ — شمارہ: ۳

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴- فون: ۸۵۶۰۰۳،۳

کراچی آفس: ۱۱-داؤد منزل متصل شاہ بخاری، شاہراہ لیاقت کراچی، فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون ۴۰/- روپے، فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ اوّل

"صَدَقَ اللّٰہُ العَظِیم"؟

"حکمتِ قرآن" کے نومبر اور دسمبر ۱۹۸۹ء کے شماروں میں "صدق اللہ العظیم، علماء و قرّاء کے لیے ایک لمحۂ فکریہ" کے عنوان سے محمدی مسجد چاندنی چوک، ناظم آباد، کراچی کے خطیب سیّد عبدالرؤف صاحب کا ایک مضمون دو اقساط میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون کراچی سے ہمارے ایک قابلِ احترام اور بزرگ ساتھی نے ارسال کیا تھا۔ مضمون نگار کے علمی مقام کے پیشِ نظر ہمارے محترم بزرگ کی تاکید تھی کہ اسے ضرور شائع کیا جائے۔ اس مضمون میں تلاوتِ قرآنِ حکیم کے اختتام پر تواتر کے ساتھ لیے جانے والے الفاظ "صَدَقَ اللّٰہُ العَظِیم" کے بارے میں معمول سے ہٹ کر ایک نقطۂ نظر پیش کیا گیا تھا اور اگرچہ اس میں انتہا پسندی کی شدّت موجود تھی تاہم چونکہ فاضل مضمون نگار نے اپنا موقف خالص علمی انداز میں پیش کیا تھا۔ لہٰذا اسے بالکلیہ نظر انداز کر دینا بھی ہمارے لیے آسان نہ تھا۔ اور چونکہ، جیسا کہ قارئینِ "حکمتِ قرآن" بھی جانتے ہیں کہ، یہ پرچہ محض "دعوت رجوع الی القرآن" کا نقیب و ترجمان ہی نہیں ایک خالص علمی رسالہ بھی ہے، جو آغاز ہی سے اپنے دامن میں ادارۂ حکمتِ قرآن کے نقطۂ نظر اور طرزِ خیال سے کسی قدر متصادم اور مخالف نقطۂ نگاہ پر مشتمل مضامین کو بھی سمونے کی گنجائش لیے ہوئے ہے، لہٰذا ہم نے سیّد عبدالرؤف صاحب کے مضمون کو "نقطۂ نظر" کے زیرِ عنوان شائع کر دیا۔ اِس لیے کہ "نقطۂ نظر" کا عنوان اس بات کا غمّاز ہوتا ہے کہ اس عنوان کے تحت پیش کیے جانے والے مقالات و مضامین کے تمام مندرجات سے ادارے کو اتفاق نہیں ہے بلکہ اس عنوان کے بین السّطور اہلِ علم حضرات کے لیے یہ دعوت موجود ہوتی ہے کہ اُن کی جانب سے اگر اِس نقطۂ نظر کے مخالف کوئی نقطۂ نظر علمی انداز میں پیش کیا جائے گا تو ہم اسے خوش آمدید کہیں گے ــــ لیکن ہمیں قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس مضمون کی اشاعت ہمارے عام قارئین میں تشویش ہی نہیں کرب و اذیّت پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ ہمیں

افسوس ہے کہ ہمارے بہت سے قارئین کو اس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔
اِس مضمون کا علمی محاکمہ کو تو اہلِ علم حضرات ہی کو زیب دیتا ہے تاہم اِس ضمن میں ہماری جانب سے حسبِ ذیل معروضات پیشِ خدمت ہیں :

(۱) ہماری رائے میں فاضل مضمون نگار کا پیش کردہ نقطۂ نظر انتہا پسندانہ ہے۔ موصوف کو جو جامعہ کراچی میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں، چونکہ اِس معاملے میں ایک ناخوشگوار تجربہ ہوا تھا کہ دورانِ لیکچر ایک مرتبہ ایک طالب علم نے انہیں قرآنی آیات کی تلاوت کے اختتام پر "صدق اللہ العظیم" نہ کہنے پر اِن الفاظ میں ٹوکا کہ "آپ ایک آیت چھوڑ گئے ہیں"۔ لہٰذا اِس معاملے میں اُن کا احساس بہت شدید ہے۔ اُن کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا ہے کہ چونکہ علماء و قراء نے اختتامِ تلاوت پر 'صدق اللہ العظیم' کہنا اپنا معمول بنالیا ہے لہٰذا اس تواترِ عمل نے عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ مغالطہ پیدا کر دیا ہے کہ شاید یہ الفاظ بھی قرآن کا مستقل حصّہ ہیں، اور اختتامِ تلاوت پر اِن الفاظ کا ادا کرنا لازمی و لابدی ہے۔ فاضل مضمون نگار کے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کا یہ مظہر ہے کہ وہ اِس مغالطے کو رفع کرنے کی کوشش میں دوسری انتہا تک جا پہنچے کہ محض اختتامِ تلاوت 'صدق اللہ العظیم' کہنے کو بدعت و گمراہی قرار دے دیا۔

(۲) یہ درست ہے کہ "صدق اللہ العظیم" کو تلاوتِ قرآن کا مستقل حصّہ سمجھنا اور اسے آیتِ قرآنی خیال کرنا کم علمی بلکہ گمراہی ہے اور اس گمراہی کی نشاندہی کرنا اور لوگوں کی غلط فہمی دُور کرنا کارِ ثواب ہے لیکن اس گمراہی کا شکار ہمارے معاشرے میں معدودے چند افراد ہی ہوں گے۔ چنانچہ یہ جانتے ہوئے کہ یہ الفاظ تلاوتِ قرآن کا مستقل اور لازمی حصّہ نہیں ہیں اگر اِن الفاظ کو محض اختتامِ تلاوت کی علامت کے طور پر زبان سے ادا کر لیا جائے تو ہماری دانست میں اِس میں کوئی قباحت نہیں ہے ——— اِس لیے کہ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ اہلِ عرب دورانِ خطاب یا تقریر بالعموم جب بھی کسی آیت کا حوالہ دیتے ہیں تو آیت کے آخر میں 'صدق اللہ العظیم' ضرور کہتے ہیں اور یہ اِس بات کی علامت ہوتی ہے کہ قرآن کے الفاظ یہاں مکمل ہوتے اب آگے مقرر کے اپنے الفاظ ہیں۔ اس لیے کہ اگر وہ 'صدق اللہ العظیم' کے الفاظ نہ کہیں تو چونکہ پوری تقریر عربی زبان ہی میں ہو رہی ہوتی ہے لہٰذا اس بات کا احتمال موجود رہتا ہے کہ سننے والا یہ امتیاز نہ کر سکے کہ کہاں کلام اللہ کے الفاظ ختم ہوئے اور کہاں سے مقرر کی اپنی بات شروع ہوئی! چنانچہ اہلِ عرب کی پیروی

میں اگر ہم عجمی لوگ بھی تلاوت کے اختتام پر "صدق اللہ العظیم" کہہ دیا کریں تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی، اِس صراحت کے ساتھ کہ اسے سورت کا حصّہ یا اس کے پڑھنے کو لازمی و ناگزیر نہ سمجھا جائے۔

(۳) تیسری اور اہم ترین بات یہ کہ اگر فاضل مقالہ نگار کا یہ مؤقف درست تسلیم کر بھی لیا جائے کہ دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں "صدق اللہ العظیم" کہنے کا کوئی سراغ نہیں ملتا، تب بھی یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس معاملے کو اب تعاملِ اُمت کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ مغربِ بعید میں مراکش اور ماریطانیہ سے لے کر مشرقِ بعید میں انڈونیشیا اور ملائشیا تک جُملہ علماء و قُرّاء اختتامِ تلاوت پر "صَدَقَ اللّٰہُ العظیم" کہنے پر اس طور سے 'عامل' ہیں کہ ہماری دانست میں اسے "غیر سبیل المومنین" میں شمار کرنا صریحاً غیر مناسب ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے "اِنَّ اُمَّتِی لَا تَجْتَمِعُ عَلٰی ضَلَالَۃٍ"[1] (ابنِ ماجہ، کتاب الفتن)، کہ "میری امت کبھی گمراہی و ضلالت پر جمع نہیں ہوگی۔" اگر فاضل مضمون نگار کی یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ یہ معاملہ گمراہی اور ضلالت کے ضمن میں آتا ہے تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مذکورہ بالا فرمان پر آنچ آتی ہے۔ اِس لیے کہ فی الحقیقت آج پوری اُمت اِس پر عامل ہے۔ چنانچہ جیسے رکوعوں اور پاروں کی تقسیم دورِ صحابہؓ میں موجود نہیں تھی بلکہ یہ بعد کا اضافہ ہے اور اسے پوری امت میں قبولِ عام حاصل ہوا ہے، اِسی طرح اختتامِ تلاوت پر 'صدق اللہ العظیم' کہنا بھی اُمت میں قبولِ عام کا درجہ رکھتا ہے لہٰذا فاضل مضمون نگار کا اسے 'غیر سبیل المومنین' میں شمار کر کے اس پر بدعت و گمراہی کا حکم لگانا ہمارے نزدیک درست نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری اِس وضاحت سے "حکمتِ قرآن" کے عام قارئین کا اضطراب

---

[1] اِسی کے ہم مضمون ایک حدیث امام ابو داؤدؒ نے بروایت حضرت ابومالک الاشعری رضؓ اپنی کتاب کے بابُ الفتن میں بھی نقل فرمائی ہے۔ پوری حدیث یوں ہے: "قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اِنّ اللہ اجارکم من ثلاثِ خلالٍ: ان لا یَدعُوَ عَلَیکُم نَبِیُّکُم فَتَہلِکُوا جَمِیعًا، وَاَنْ لَا یَظْہَرَ اَہْلُ الْبَاطِلِ عَلٰی اَہْلِ الْحَقِّ وَاَنْ لَا تَجْتَمِعُوا عَلَی الضَّلَالَۃِ۔"

رفع ہو گیا ہوگا۔ تاہم اُن تمام قارئین سے جو اِس نوع کے مضامین کی اشاعت سے بے چینی محسوس کرتے ہیں، ہماری درخواست ہے کہ وہ اِس قسم کے اختلافی نقطۂ نظر کے حامل علمی مضامین کے مطالعے کے لیے بھی اپنے ذہن کے دریچے کشادہ رکھیں۔ دیکھیے ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ زیرِبحث مضمون کی اشاعت سے ہمارے بعض ساتھیوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا ہے۔

اس پوری بحث سے جو باتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں، اُن کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

(i) تلاوتِ قرآن کے اختتام پر کہے جانے والے الفاظ، 'صدق اللہ العظیم' آیاتِ قرآنیہ کا جزو نہیں ہوتے بلکہ یہ اضافی الفاظ ہیں جو محض اختتامِ تلاوت کی علامت کے طور پر پڑھے جاتے ہیں اور چونکہ قرآنِ حکیم دراصل فطرتِ انسانی کا ترجمان ہے اور اس کی ہر ہر آیت پر بندۂ مومن کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز اُبھرتی ہے کہ اللہ نے بالکل سچ کہا ہے۔ لہٰذا اختتامِ تلاوت کی علامت کے طور پر 'صدق اللہ العظیم' کے الفاظ بڑے موزوں اور برمحل معلوم ہوتے ہیں۔

(ii) ان الفاظ کو آیاتِ قرآنیہ کا حصّہ سمجھنا لاعلمی اور گمراہی ہے۔

(iii) تلاوتِ قرآن کے اختتام پر ہمیشہ 'صدق اللہ العظیم' کہنا ہرگز لازمی و لابدی نہیں ہے۔ بلکہ کبھی کبھی اسے ترک کر دینا مستحسن ہوگا۔ اِس لیے کہ سنّتِ نبویؐ میں اس کا ثبوت بہرحال ہمیں نہیں ملتا تاہم چونکہ یہ بجزاب تعاملِ اُمت میں شامل ہے لہٰذا اسے بدعت و گمراہی قرار دینا بھی درست نہیں ہے۔

(iv) اِس امر کے اظہار کے لیے کہ یہ الفاظ قرآن کا حصّہ نہیں ہیں، اسے قرأتِ قرآن سے مختلف لہجے میں پڑھنا بہتر ہوگا۔ یعنی جس لحن اور لہجے میں آپ قرآنی آیات کی تلاوت کرتے ہیں، 'صدق اللہ العظیم' کا اُس لہجے میں نہ پڑھنا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ یہ فرق نمایاں رہے کہ یہ الفاظ آیاتِ قرآنیہ کا جزو نہیں بلکہ اُن سے جُدا ہیں۔

اللّٰھم ارنا الحق حقًا وّارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہٗ (آمین)

اِس سال مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام سالانہ محاضراتِ قرآنی کا انعقاد ان شاء اللہ العزیز ۱۹ تا ۲۳ مارچ ہوگا۔ انہی دنوں یعنی ۱۹ تا ۲۳ مارچ تنظیمِ اسلامی کا پندرہواں سالانہ اجتماع بھی منعقد ہوگا۔ محاضرات کے لیے شام کے اوقات معیّن رہیں گے جبکہ تنظیمِ اسلامی کے پروگرام صبح کے اوقات میں ہوں گے۔ ان دونوں پروگراموں کی تفاصیل شمارۂ ہٰذا کے کور کے اندرونی صفحات پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ■

مولانا محمد تقی امینی

روزہ کے ذریعے انسان کی اصلاح و درستی کا حکم

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے۔ اسی کی مناسبت سے حکم و احکام کی ترتیب ہے۔ اوپر مقتولوں میں برابری اور حقوق کی حفاظت کا حکم ہے، بعد میں جہاد و قتال کا حکم ہے۔ درمیان میں روزہ کا حکم دیا گیا کہ اس کے ذریعہ انسان کی اصلاح و درستی ہو اور حق و انصاف پر قائم رہنے میں سہولت ہو۔ انسان کو اللہ نے بیشمار خوبیوں سے نوازا ہے لیکن اس میں خامیاں بھی ہیں جو خوبیوں کے ابھرنے میں رکاوٹ بنتی ہیں اور ایسے غلط کام پر لگا دیتی ہیں جو انسان کے کردار کو داغدار بنا دیتی ہیں۔ اللہ نے خامیوں کی اصلاح کے لیے روزمرہ کی زندگی میں عبادت و نیکی کے بہت سے طریقے مقرر کئے ہیں۔ روزہ کو ان میں خاص اہمیت ہے، جس کے ذریعہ انسان کو اپنی طبیعت دبانے اور اپنے اوپر قابو پانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ پھر خامیوں کو دور کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَيَّامًا
مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَي الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ
فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ
خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
(البقرہ : ۱۸۳/۱۸۴)

اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تمہاری اصلاح ہو جائے۔ (یہ روزے) گنتی کے چند دن ہیں

(۲۹ یا ۳۰ دن) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو جائے یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے یہ گنتی پوری کرے۔ اور ان لوگوں پر جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں ان پر (بطور) فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے[1] پھر جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تو (بہرحال) بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

---

[1] اس آیت کی تفسیر میں ہمارے مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں، لیکن کسی کو ایسی سند نہیں حاصل ہے کہ دوسرے قول کو بالکل رد کر دیا جائے۔ مثلاً:-

(۱) کسی نے اس سے مراد ایسے بوڑھے اور ایسے بیمار لیا ہے جن میں روزہ کی طاقت کی امید نہ ہو۔

(۲) کسی نے اس سے صدقۂ فطر مراد لیا ہے۔

(۳) کسی نے یہ ابتداء کے لیے تسلیم کیا ہے کہ پہلے روزہ کا حکم اختیاری تھا کہ اگر ایک مسکین کو کھانا کھلا دے تو روزہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا تھا۔ بعد میں یہ حکم موقوف ہو گیا۔

ان اقوال میں جس کو جو قول پسند آئے وہ اختیار کر لے۔

ان اقوال میں ایک اور قول کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے جس کو وجوبی حکم کا درجہ تو حاصل نہیں ہے لیکن استحباب کے درجہ کی پابندی تسلیم کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ استحباب کے درجہ کی پابندی کا زیادہ تعلق انسان کے ضمیر سے ہے۔ اللہ اور بندہ کے درمیان محبت کا رشتہ قائم ہو جائے تو اس پابندی کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ قانون کی خشکی کو جب تک محبت کی چاشنی نہ دی جائے ہر حکم پر عمل کرنے میں دشواری ہوتی ہے خواہ وجوبی حکم ہو یا استحبابی حکم ہو۔

وہ قول یہ ہے کہ آیت کا تعلق مریض اور مسافر ہی سے رکھا جائے اور مریض و مسافر کی دو قسمیں کی جائیں۔

(۱) وہ مریض و مسافر جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہے۔ یعنی روزہ رکھنے میں ان کو زیادہ مشقت نہیں برداشت کرنی پڑتی ہے لیکن مرض اور سفر کی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس لیے اس کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں اور جس قدر ہو سکے خوشدلی کے ساتھ زیادہ دیں۔ قضاء تو بعد میں بہرحال ہے، لیکن قضاء اور فدیہ (ایک مسکین کو کھانا کھلانا) دونوں مل کر بھی اصل روزہ کے فائدہ کو نہیں پہونچ سکتے ہیں۔ اس لیے کہا گیا کہ ان سب کے باوجود روزہ رکھنا ہی بہتر ہے۔

اس قول سے آیت کا باہمی تعلق جوڑنے میں سہولت ہوتی ہے اور مریضوں اور مسافروں کے درمیان جو فرق ہوتا ہے اور جس کی بنا پر اعتراض کیا جاتا ہے (کہ کسی کو زیادہ سہولت اور کسی کو زیادہ دشواری میں دونوں کا حکم ایک ہے اور رخصت سے فائدہ اٹھانے میں دونوں برابر ہیں) اس کی کچھ رعایت ہو جاتی ہے اور غریبوں کے فائدہ کی بھی ایک شکل نکل آتی ہے۔ وجوبی حکم اس لیے نہیں کہا سکتا ہے کہ "زیادہ مشقت" کی حد بندی نہیں کی جا سکتی ہے کہ کس حد کو زیادہ مشقت سمجھا جائے اور کس کے لیے کتنی "زیادہ مشقت" کا اعتبار کیا جائے اسی بنا پر روزہ میں رخصت کی علت مشقت کو نہیں بنایا گیا کہ اس کی حد بندی نہیں کی جا سکتی ہے۔ بلکہ مرض اور سفر کو بنایا گیا ہے جو سب کے لیے عام ہے۔ شریعت کے ہر وجوبی حکم میں اس کی رعایت ضروری ہوتی ہے کہ وہ کسی کے لیے خاص نہ ہو بلکہ سب کے لیے عام ہو[1]

(۲) وہ مریض و مسافر جن کو روزہ رکھنے میں زیادہ مشقت ہو رہی ہے ان کا حکم آگے آرہا ہے۔ ان کے بارے میں مذکورہ پابندی نہیں ہے۔ اس صورت میں ایک ہی حکم کے تکرار کی بات بھی ختم ہو جاتی ہے کہ آنے والا حکم ان مریضوں اور مسافروں کے لیے ہے جن کو روزہ رکھنے میں زیادہ مشقت ہوتی ہے، جبکہ یہ حکم ان کے لیے ہے جن کو روزہ رکھنے میں زیادہ مشقت نہیں ہوتی ہے۔

روزہ کے لیے مہینہ کا انتخاب

روزہ کی فضیلت و بڑائی کے لیے یہی بات کیا کم تھی کہ اس میں بندہ اپنی مرضی اور خواہش کو اللہ کی مرضی اور خواہش میں گم کر دیتا ہے۔ پھر اللہ کی رضا و خوشنودی کا وہ مقام حاصل کر لیتا ہے کہ کسی اور عبادت سے یہ مقام نہیں حاصل ہوتا ہے۔ لیکن فضیلت و بڑائی کی بات اسی پر نہیں ختم ہوتی ہے بلکہ اس کو "دو آتشہ" بنانے کے لیے اس کے دنوں کا انتخاب ایک ایسے مہینے میں ہوا جس کو وہ فضیلت و بڑائی حاصل ہے جو کسی اور مہینہ کو نہیں حاصل ہے۔ وہ ہے رمضان کا مہینہ جس میں نبوت کی تاجپوشی کی گئی، یعنی جس کی شب قدر میں نبوت کا تاج حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر رکھا

---

[1] اس بحث کو سمجھنے کے لیے راقم الحروف کی کتاب "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر" بحث "قیاس" کا مطالعہ مفید رہے گا جو ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ سے شائع ہو رہی ہے۔

گیا، جس سے ہدایت و سربراہی کے لیے پہلے نبیوں کا دور گزر کر آپ کے سنہرے دور کی بنیاد پڑی اور جس میں اللہ کا آخری ہدایت نامہ یعنی قرآن اتارا گیا جس سے ہمیشہ کے لیے ساری دنیا کی ہدایت و رہنمائی کا انتظام ہوا اور ہدایت کرنے کی راہ سے دوسری قوموں کو جو بڑائی اور برتری حاصل تھی وہ "امتِ مسلمہ" کے حصہ میں آئی۔ ظاہر ہے کہ روزہ کے دنوں کے لیے کسی اور مہینہ کا انتخاب ان فضیلتوں اور بڑائیوں کو اپنے اندر نہ سمیٹ سکتا تھا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝ (البقرہ : ۸۵/۸۶)

(روزہ کے لیے گنتی کے چند دن) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، جو لوگوں کے واسطے ہدایت ہے اور جس میں ہدایت اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی روشن دلیلیں ہیں۔ جو کوئی اس مہینہ کو پائے تو اس کے روزے رکھے۔ (ہاں) اگر مریض و مسافر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرے (قضا کرے)۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، تم پر تنگی نہیں چاہتا ہے اور تاکہ تم گنتی پوری کر لو اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہاری رہنمائی کی اور تاکہ تم اللہ کا شکر کرو۔ اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں۔ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ

"شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن"

مولانا محمد سعید الرحمان علوی

(۹ اگست ۱۹۸۹ء کو پنجاب پبلک لائبریری ہال میں علامہ شبیر بخاری کی زیرِ صدارت پڑھا گیا۔ (ادارہ)

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(سورۃ التوبہ : ۱۱۱، ۱۱۲)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لیں اور ان کا مال بھی، اور اس قیمت پر خرید لیں کہ ان کے لئے بہشت (کی جاودانی زندگی) ہو، وہ (کسی دنیوی مقصد کی راہ میں نہیں بلکہ) اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں، یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) تورات، انجیل، قرآن (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے، اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو! پس (مسلمانو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ تعالیٰ

سے چکایا خوشیاں مناؤ اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فیروزمندی ہے (ان لوگوں کے اوصاف واعمال کا یہ حال ہے کہ (اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے) توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنے والے، سیر وسیاحت کرنے والے، رکوع وسجود میں جھکنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے ہیں (اے پیغمبر یہی سچے مومن ہیں) اور مومنوں کو (کامیابی وسعادت کی) خوش خبری دے دو۔"

(مولانا ابوالکلام: ترجمان القرآن ج ۳ ص ۲۴۲ - ۲۴۵ دہلی)

قرآن کریم کی دو آیات، توضیحی ترجمہ کے ساتھ سامنے آئی ہیں، ان آیات میں بیان کردہ مضامین ومفاہیم کی تفصیل بیان کرنا مقصد ہے نہ وقت اس کی اجازت دیتا ہے، لیکن زیر بحث موضوع کے ساتھ چونکہ ان آیات کی گہری مناسبت ہے اس لئے ایسا کرنا ضروری سمجھا گیا۔ برعظیم ہندوپاک میں قرآن عزیز کے سب سے بڑے خادم خانوادہ ولی اللّٰہی کے ایک رکنِ رکین مولانا ابوالکلام آزاد نے پہلی آیت کے حوالے سے جو لکھا اس کا بیان بھی ضروری ہے تاکہ بات زیادہ واضح ہو سکے:۔

"اس آیت میں "حُبِّ ایمانی" کی حقیقت واضح کی ہے۔ فرمایا: جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تو ایمان کا معاملہ یوں سمجھو کہ انہوں نے اپنا "سب کچھ" اللہ تعالےٰ کے ہاتھ بیچ ڈالا، جان بھی اور مال ومتاع بھی، اب ان کی کوئی چیز ان کی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ اور اس کی سچّائی کی ہوگئی۔

بندگانِ تو در عشق خداوندانند
دو جہاں را بہ تمنائے تو بفروختہ اند

اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے معاوضے میں کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ نعیم ابدی کی کامرانیاں انہیں عطا فرمائیں۔ یہ گویا خرید وفروخت کا ایک معاملہ تھا جو اللہ تعالیٰ میں اور عُشّاقِ حق میں طے پا گیا۔ اب نہ بیچنے والا اپنی متاع

واپس لے سکتا ہے نہ خریدنے والا قیمت لوٹائے گا .....
اور چونکہ مقصود اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کا اظہار تھا اس لئے
معاملے کو اپنی طرف سے شروع کیا نہ کہ بیچنے والوں کی طرف ، یعنی
یہ نہیں کہا کہ مومنوں نے بیچ ڈالی بلکہ کہا " اللہ تعالےٰ نے مومنوں سے
خرید لی" گویا معاملے کا طالب وہ تھا حالانکہ ہر طرح کی طلب و احتیاج
سے وہ منزہ ہے اور جو متاع اس نے قبول کی وہ بھی اسی کی تھی اور
جو کچھ معاوضے میں بخشا وہ بھی اس کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے "

(ص ۳۴۳ - ۳۴۴)

متاعِ ایمان جیسی عظیم نعمت تو بہت سوں کو حاصل ہو جاتی ہے لیکن " حُبِّ ایمانی" کی لذّت کم ہی خوش نصیبوں کو میسّر آتی ہے اور جنھیں یہ لذّت میسّر آجاتی ہے وہ راہِ حق میں سب کچھ قربان کر گزرتے ہیں ـــــ ان کے جذباتِ ایثار و قربانی کا وہ حال ہوتا ہے جو " الصّٰفّٰت " میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دو بندوں سیّدنا ابراہیم و اسمعیل علیہما الصلوٰۃ والتسلیم کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا "فَلَمَّآ اَسْلَمَا...." تسلیم و رضا کی اس کیفیت کی انتہا مرتبۂ شہادت پر سرفرازی ہے ـــــ جو بندۂ مومن کا مقصود و مطلوب ہے لیکن مالکِ حقیقی کے مخلص بندے جانِ نحیف کا نذرانہ حضرتِ حق کے حضور پیش کرنے کے بعد بھی اس احساس کا شکار ہوتے ہیں کہ :

؎ جان دی ، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق اَدا نہ ہُوا

جو شہادت اس وقت زیرِ بحث ہے اور جسے "مطلوب و مقصودِ مومن" کہا گیا ہے اور واقعۃً ہے بھی ایسا ، اس کا لُغوی مفہوم "گواہی اور قطعی خبر" ہے ـــ مشہور لغوی امام راغب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول

" وہ بات جو کامل علم و یقین سے کہی جائے خواہ وہ علم مشاہدۂ بصر سے ہوا ہو یا بصیرت سے" : (اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱۱ ص ۸۱۶ پنجاب یونیورسٹی لاہور)

جب کہ شریعت کی اصطلاح میں :

" ایک مسلمان کی بلا شرکت غیرے اللہ تعالےٰ کی اطاعت اور حضرت محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کی رسالت کے اقرار کو شہادت کہا جاتا ہے ۔ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنے کی غرض سے ایک مسلمان کا میدانِ جنگ میں اپنی جان دے دینا بھی شہادت ہے ۔ ایسے مسلمان کو شہید کہتے ہیں جو لفظ شہادت ہی سے مشتق ہے ۔"

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۱۱ : ۸۱۶)

گویا اعلیٰ ترین مقاصد کے لئے ـــــ کلمۃ اللہ کے اعلاء کے لئے جاں فروشی اور جاں سپاری کا نام شہادت ہے ـــــ اور یہی مطلوب ومقصودِ مومن ہے ـــــ جیسا کہ عرض کیا گیا یہ سعادت کم ہی لوگوں کے حصّہ میں آتی ہے ـــــ النساء کی آیت ۶۶ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ۔

" اور (دیکھو) اگر ہم انہیں حکم دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو (یعنی لڑتے لڑتے لڑائی میں جان دے دو) اور حکم دیتے کہ اپنے گھروں سے (ہجرت کرکے) نکل کھڑے ہو، تو (ان کا کیا حال ہوتا ؟ یہ ہوتا کہ) چند آدمیوں کے سوا کوئی بھی اس کی تعمیل نہ کرتا حالانکہ جس بات کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے اگر یہ اس پر عمل کرتے تو ان کے لئے بہتری بھی تھی اور (راہِ حق میں) پوری طرح جمے بھی رہتے ۔" (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۶-۴۸۵)

اور البقرۃ : ۲۴۹ میں جناب طالوت کے ایک لشکر کا ذکر کیا گیا جو بڑے دعاوی کے ساتھ گھر سے دشمن کا مقابلہ کرنے نکلا اور اسے ایک ندی کی آزمائش سے دوچار کیا گیا ـــــ پھر کیا ہوا ؟ یہی کہ

" بہت تھوڑے لوگ اس آزمائش میں کامیاب اُترے "

لیکن جو تھوڑے سے لوگ کامیاب قرار پائے اور آزمائش میں پورے اترے ـــــ ان کا کہنا تھا کہ

(تم دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلّت سے ہراساں کیوں ہوئے جاتے ہو)
کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر حکمِ الٰہی سے غالب آگئیں
اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔ (ج ۲ ص ۲۲۲)

گویا "جو لوگ ایک گھڑی کی پیاس ضبط نہیں کر سکتے وہ میدانِ جنگ کی محنتیں کیوں کر برداشت کریں گے؟ اور جو برداشت کر گزرتے ہیں اور "یَقْتُلُوْنَ اور یُقْتَلُوْنَ" کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں ـــــ ان کے لئے اس دنیا میں بھی کامیابی ہے اور آنے والی دنیا میں بھی ـــــ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی رفاقت و معیّت کو اللہ رب العزّت نے "حَسُنَ اولٰئِكَ رفيقا" فرمایا ـــــ (النساء : ۶۹)۔

راہِ حق کی موت ـــــ موت نہیں، بلکہ حقیقی زندگی ہے، نہ صرف متعلقہ شخص کی بلکہ ساری قوم کی۔ شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

اس موت کو اللہ تعالےٰ نے ان الفاظ میں ذکر کیا کہ حکم دے دیا گیا کہ جو لوگ اس راستہ میں مر کر اس نعمت سے سرفراز ہو جائیں ان کو مُردہ کہنے کی اجازت نہیں۔ ـــــ بلکہ ایسا گمان و خیال بھی نہ کرو ـــــ یہ لوگ زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے شاداں و فرحاں ـــــ روحانی رزق سے متمتع ہونے والے ـــــ (البقرۃ : ۱۵۴۔ آل عمران : ۱۷۰) یہ وہ راہ ہے جس کی خواہش و تمنّا خود اس ذاتِ گرامی نے کی ـــــ جس کا وجود مقصدِ تخلیقِ کائنات ہے ـــــ جو عمر بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ـــــ کا مصداق اور اپنے پروردگار کا محبوب ہے، لیکن اس کی خواہش ہے، ایک بار نہیں بار بار کہ وہ صبحِ قیامت اپنے رب کے حضور اس طرح حاضر ہو کہ اس کی پیشانی خون آلود ہو اور اس کے کپڑے لہو میں تر بتر ـــــ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ـــــ محدّثِ امّت ـــــ فرماتے ہیں کہ امام الرسل، خاتم الانبیاء والمعصومین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلّم نے فرمایا:

لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ۔ (بخاری۔ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح

ج ۲ ص ۱۱۱۸ ـــــ المکتب الاسلامی، بیروت)

میری خواہش ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں ـــــ اور ایسا بار بار ہو... الخ

امام خاتم و معصوم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ـــــ اپنے آقا و مولا علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حوالہ سے فرمایا:

صبحِ قیامت ایک فرد بھی ایسا نہ ہوگا جو دنیا میں واپسی کا خواہش مند ہو گو کہ اس طرح اسے دنیا بھر کی نعمتیں میسّر آجائیں ہاں شہید کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ شہادت پر سرفراز ہونے کے سبب جس عزت و کرامت سے بہرہ ور ہوگا اس کی وجہ سے اس کی خواہش ہوگی کہ وہ دنیا میں لوٹایا جائے اور بار بار (دس بار) راہِ حق میں مارا جائے

(بخاری مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ج ۲ : ۱۱۲۰)

حضرت الامام ترمذی اور حضرت الامام ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی کتابوں میں حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی کہ سیّد ولدِ آدم خاتم النبیّین والمعصومین صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

ہر مرنے والے کا نامۂ عمل مرنے کے ساتھ ہی لپیٹ دیا جاتا ہے۔ ہاں شہیدِ راہِ حق کا معاملہ مستثنیٰ ہے کہ وہ ایک تو قبر کے فتنہ سے محفوظ رہتا ہے دوسرے صبحِ قیامت تک ایثار و قربانی کے سبب اس کے نامۂ عمل میں اضافہ ہوتا رہے گا ـــــ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۱۱۲۴)

اس مرحلہ پر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خواہش کے باوصف شہادت سے سرفراز نہیں ہو سکتے۔ اس کی دورِ اوّل میں ایک بہت ہی اہم مثال حضرت خالد بن الولید سیف من سیوف اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ـــــ جن کی قبولِ اسلام کے بعد ساری زندگی انہی معرکوں میں گزری اور ان کے وجود مقدس کا ہر حصّہ زخمی تھا لیکن موت ـــــ چارپائی پر ـــــ سبب تو محدّثین و شارحین

(تم دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلّت سے ہراساں کیوں ہوئے جاتے ہو)
کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر حکمِ الٰہی سے غالب آگئیں
اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔ (ج ۲ ص ۲۲۲)

گویا "جو لوگ ایک گھڑی کی پیاس ضبط نہیں کر سکتے وہ میدانِ جنگ کی محنتیں کیوں کر برداشت کریں گے؟ اور جو برداشت کر گزرتے ہیں اور "یَقْتُلُوْنَ اور یُقْتَلُوْنَ" کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں ـــــ ان کے لئے اس دنیا میں بھی کامیابی ہے اور آنے والی دنیا میں بھی ـــــ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی رفاقت و معیّت کو اللہ رب العزّت نے "حَسُنَ اولٰئِكَ رفيقا" فرمایا ـــــ (النساء : ۶۹)۔

راہِ حق کی موت ـــــ موت نہیں، بلکہ حقیقی زندگی ہے، نہ صرف متعلقہ شخص کی بلکہ ساری قوم کی ـــــ شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

اس موت کو اللہ تعالےٰ نے ان الفاظ میں ذکر کیا کہ حکم دے دیا گیا کہ جو لوگ اس راستہ میں مر کر اس نعمت سے سرفراز ہو جائیں ان کو مُردہ کہنے کی اجازت نہیں۔ ـــــ بلکہ ایسا گمان و خیال بھی نہ کرو ـــــ یہ لوگ زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے شاداں و فرحاں ـــــ روحانی رزق سے متمتع ہونے والے ـــــ (البقرۃ : ۱۵۴۔ آل عمران : ۱۷۰) یہ وہ راہ ہے جس کی خواہش و تمنّا خود اس ذاتِ گرامی نے کی ـــــ جس کا وجود مقصدِ تخلیقِ کائنات ہے ـــــ جو بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر ـــــ کا مصداق اور اپنے پروردگار کا محبوب ہے، لیکن اس کی خواہش ہے، ایک بار نہیں بار بار کہ وہ صبح قیامت اپنے رب کے حضور اس طرح حاضر ہو کہ اس کی پیشانی خون آلود ہو اور اس کے کپڑے لہو میں تر بتر ـــــ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ـــــ محدّث امّت ـــــ فرماتے ہیں کہ امام الرسل، خاتم الانبیاء والمعصومین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلّم نے فرمایا:

لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ۔ (بخاری۔ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح

ج ۲ ص ۱۱۱۸ ـــ المکتب الاسلامی، بیروت)

میری خواہش ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں ـــــ اور ایسا بار بار ہو... الخ

امام خاتم و معصوم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ـــ اپنے آقا و مولا علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حوالہ سے فرمایا:

صبحِ قیامت ایک فرد بھی ایسا نہ ہوگا جو دنیا میں واپسی کا خواہش مند ہو گو کہ اس طرح اسے دنیا بھر کی نعمتیں میسّر آجائیں ہاں شہید کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ شہادت پر سرفراز ہونے کے سبب جس عزت و کرامت سے بہرہ ور ہوگا اس کی وجہ سے اس کی خواہش ہوگی کہ وہ دنیا میں لوٹایا جائے اور بار بار (دس بار) راہِ حق میں مارا جائے

(بخاری مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ج ۲ : ۱۱۲۰)

حضرت الامام ترمذی اور حضرت الامام ابوداؤد رحمھما اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی کتابوں میں حضرت فضالۃ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی کہ سیّد ولدِ آدم خاتم النبیین والمعصومین صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

ہر مرنے والے کا نامۂ عمل مرنے کے ساتھ ہی لپیٹ دیا جاتا ہے۔ ہاں شہیدِ راہِ حق کا معاملہ مستثنیٰ ہے کہ وہ ایک تو قبر کے فتنہ سے محفوظ رہتا ہے دوسرے صبحِ قیامت تک ایثار و قربانی کے سبب اس کے نامۂ عمل میں اضافہ ہوتا رہے گا ـــــ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۱۱۲۴)

اس مرحلہ پر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خواہش کے باوصف شہادت سے سرفراز نہیں ہو سکتے۔ اس کی دورِ اوّل میں ایک بہت ہی اہم مثال حضرت خالد بن الولید سیف من سیوف اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ـــــ جن کی قبولِ اسلام کے بعد ساری زندگی انہی معرکوں میں گزری اور ان کے وجود مقدس کا ہر حصّہ زخمی تھا لیکن موت ـــــ چارپائی پر ـــــ سبب تو محدّثین و شارحین

نے یہ لکھا کہ :

"پیغمبر اسلام نے انہیں اللہ کی تلوار قرار دیا ـــــ معرکہ میں ان کی موت پر یہ کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کی تلوار ٹوٹ گئی ـــــ الٰہی غیرت اس کو برداشت نہیں کر سکتی"

تاہم اُن کا غم اپنی جگہ ـــــ اور ایسے ہی ایک مثال دورِ آخر کی ـــــ استاذ الاساتذہ، امام حُرّیت مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الھند کی ہے جنہوں نے برعظیم کی آزادی کے لئے زبردست جدوجہد کی ـــــ مالٹا کی اسارت میں بے پناہ مصائب برداشت کئے اور پھانسی کی سزا پائی ـــــ جو بعد میں قید میں تبدیل ہوئی ـــــ ۱۹۲۰ء میں دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان پر وفات پائی ـــــ مصدقہ روایت ہے کہ وقت وفات بچّوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے ـــــ وجہ پوچھی تو فرمایا :

"خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اس طرح مرتا کہ گھوڑے میرے وجود کو روند ڈالتے لیکن وائے حسرتا کہ ایسا نہ ہو سکا"

ایسے بلانوشانِ محبت کے لئے پیغمبر خاتم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ :

"جو صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے اللہ تعالےٰ سے شہادت کا سوال کرے گا اس کے صدق و خلوص کے سبب اللہ تعالےٰ اسے یہ مقام رفیع بخش دے گا اگرچہ اس کی موت بستر پر واقع ہو"

(مشکوٰۃ بحوالہ مسلم روایت حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ ج ۲ ص ۱۱۲۱)

اور جو ابناء زر اور پرستگانِ دنیا ایسے ہوں گے جن کے دل میں کبھی اس مقامِ رفیع کے حصول کی خواہش پیدا نہ ہوئی ہوگی اور بقول خلیفۂ راشد و رابع سیّدنا علی المرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ "کلاب دنیا" (دنیا کے کُتّے) بن کر رہ گئے ہوں گے، ان کے لئے امام الانبیاء والرسل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم فرماتے ہیں :

"کہ وہ منافقت کی موت مریں گے (مسلم عن ابوھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مشکوٰۃ ج ۲ ص ۱۱۲۲)

راہ حق کی جدوجہد کے لئے قرآن عزیز میں ابتداء میں جو آیات نازل ہوئیں اور جن کے ذریعہ اس جدوجہد کی اجازت دی گئی وہ ہیں آیاتِ حج : ۳۹-۴۰-۴۱، جن کا خلاصہ اس طرح ہے :

۱- راہ حق میں مسلح ہو کر نکلنا ان لوگوں کے لئے ہے جنھیں ظلم و زیادتی کا نشانہ بنایا گیا ـــــ محض اس لئے کہ وہ دینِ اسلام کا نام کیوں لیتے ہیں ـــــ گویا مذہبی آزادی پر قدغن کے بعد جہاد لازم ہے ۔

۲- دوسرا سبب " معابد " کا تحفظ ہے نہ صرف مساجد کا بلکہ ہر اس معبد کا " جس میں ذکر الٰہی ہوتا ہو " (فقہ السنۃ للسید سابق ج ۲ ص ۶۲۰)

اور النسأ کی آیت ۷۵ میں مظلوم کی حمایت و نصرت کے لئے جہاد لازم قرار دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ طبائع پر گراں گذرتا ہے لیکن البقرۃ آیت ۲۱۶ میں فرمایا گیا ۔

"کہ تمہاری ہر ناپسندیدہ چیز واقعۃً ناپسندیدہ ہو اور تمہاری پسندیدہ اشیاء واقع میں ایسی ہوں ؟ ضروری نہیں ـــــ ہر چیز کی اصلیت سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے کہ اس کا انجام بہتر ہے یا اس کے برعکس "

عام حالات میں اس راستہ کو اپنانا ـــــ فرض کفایہ ہے۔ لیکن ایسے بھی حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ جب یہ فرضِ عین ہو جاتا ہے حتّٰی کہ عورتیں بھی اس عمل میں شامل ہو جاتی ہیں، جس کی تفصیل احادیث و فقہ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

پیغمبرِ خاتم کے عم زاد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما نے ـــــ حضورِ اقدسؐ کے حوالہ سے مجاہدینِ راہِ حق کو " خیر الناس " اور " افضل الناس " قرار دیا ـــــ اور حضورِ اقدسؐ نے ایک ایسے شخص کو جو گوشۂ عافیت کا رسیا تھا، منع فرمایا اور فرمایا :

ایسے مت کرو ۔ راہ حق کی کاوش ستّر سال کی عبادت سے افضل ہے ..... اور مجاہد فی سبیل اللہ کے لئے جنت واجب و لازم ہو

جاتی ہے (فقہ السنۃ ج ۲ ص ۶۲۰)

اور فرمایا:

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ـــــ اسلام کے دین حق ہونے اور محمد کریمؐ کو نبی مان لینے والے کے لئے جنت اور مجاہد کے لئے بھی جنت ـــــ لیکن پہلے شخص اور اس شخص کے مقام میں جو فرق ہوگا اس کا فاصلہ ایسے ہے جیسے زمین و آسمان کا فاصلہ ـــــ (فقہ السنۃ ج ۲ ص ۶۲۰)

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے

فی سبیل اللہ قتل ہونے والے کو جہاں شہید قرار دیا وہاں فی سبیل اللہ مرنے والے کو اسی طرح طاعون میں، پانی میں ڈوب کر مرنے والے کو بھی شہید قرار دیا اور حالت زچگی میں اللہ تعالیٰ کو پیاری ہونے والی خاتون کو بھی ـــــ اور اپنے دین، خون اور عزت کی حفاظت میں مرنے والے کو بھی شہید بتلایا (فقہ السنۃ ج ۲ ص ۶۳۳)

یہ سب حوادث ہیں، حادثاتی موت کی ہر شکل اس میں شامل ہے لیکن اصل معاملہ اسی کا ہے جو اپنا انگ انگ راہ حق میں کٹوا کر سرخ رو ہو جائے ـــــ اسے بغیر غسل دیئے اور جسم کے اصلی کپڑے اتارے بغیر سپرد لحد کیا جائے گا ـــــ جس کے زخموں سے صبح قیامت خون بہے گا اور اتنا اکرام ہوگا کہ وہ واپسی کی تمنا کرے گا۔ ـــــ یہاں ذہن میں رہے کہ دشمن کی جان بوجھ کر خواہش کرنا کہ وہ الجھے پسندیدہ عمل نہیں۔

ـــــ ارشاد نبوی ہے۔

لوگو! دشمن کی ملاقات کی خواہش سے بچو ـــــ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو ہاں ایسا مرحلہ آجائے تو صبر و ثبات سے کام لو اور سمجھ لو کہ جنت تلواروں کی چھاؤں تلے ہے۔ (فقہ السنۃ ج ۲ ص ۶۳۸)

جو لوگ راہ حق کی صعوبتیں برداشت کر کے موت سے آنکھیں چار کر لیتے ہیں اور فیضؔ کے بقول ؎

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

انہی کے لئے حیاتِ ابدی کا وعدہ ہے ـــــ انہیں ہی مردہ کہنے سے روکا گیا اور انہی کے لئے فرمایا گیا کہ وہ اپنے رب کے رزق سے متمتع ہوتے اور اس کی نعمتوں سے شاد کام ہیں ۔ سیّد سابق کے بقول

ان القتل فی سبیل اللہ لیس موتًا ابدیًا وانما ھو انتقالٌ الی ما ھُوَ اَرْقی وابقی وان الفنأُ فی سبیل اللہ ھو عین البقاء.

(فقہ السنۃ ج ۲ ص ۶۰۲)

فی سبیل اللہ قتل ، موت ابدی نہیں بلکہ منتقل ہونا ہے ایسے مقام کی طرف جو بلند و بالا اور باقی رہنے والا ہے اور فی سبیل اللہ فنا ہو جانا عین بقا ہے۔

راہِ حق کی یہ کاوش و سعی جس میں گھوڑے کے نتھنوں کی مٹی بھی ـــــ قرآن مجید میں باعث قسم قرار پائی ، اس کے لئے پیغمبر اسلام کی خواہش و تمنا سابق میں گذری ـــــ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے عبقری و محدث اسلام ـــــ "شہید محرم فی المدینۃ" کی تمنا معروف ہے کہ "خدایا مجھے اپنے نبیؐ کے شہر میں شہادت کی موت سے سرفراز فرما"

اور خلیفۂ ثالث وراشد سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہر قسم کے دفاعی اقدامات سے بے نیاز اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ـــــ بھی درحقیقت شوقِ شہادت ہی کے سبب تھا کہ انہیں اس کی پیغمبر اسلام کی زبانِ مبارک سے خوشخبری مل چکی تھی ـــــ غزوہ احد جس میں رسول رحمتؐ زخمی ہوئے ۔ ستر صحابہ شہید ہوئے اور پیغمبر اسلام کے چچا حضرت حمزہ مظلومانہ شہید ہو کر سید الشہداء قرار پائے اس کی پہلی شب حضرت عبد اللہ بن جحش اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے دعائیں مانگیں ـــــ حضرت عبد اللہ کی دعا مردانہ وار مقابلہ کے بعد شہادت کی تھی ـــــ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی ۔ (خمیس) حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غسل کی حاجت کے باوصف شہید ہونے کا شرف حاصل کیا اور غسیلِ ملائکہ قرار پائے ۔

ـــــــ ٹانگ سے معذور حضرت عمرو بن الجموح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بصد مشکل حضور اقدس سے اجازت لے کر جنگ میں شرکت کی اور عرض کیا اے رسول محترم! میرے بیٹے جنت میں جائیں، میں رہ جاؤں ـــــ اجازت ملی، شہید ہوئے ان کی اہلیہ اور صاحبزادے نے لاش مدینہ لے جانا چاہی لیکن ممکن نہ ہو سکا کہ ان کی دعا تھی ـــــ "مولا مجھے اپنے اہل کی طرف نہ لوٹائیو" (قرۃ العیون)۔

نازونعم میں پلے مصعب بن عمیرؓ ـــــ جو اماں عائشہؓ کے دوپٹے سے بنے اسلام کے پہلے علمبردار تھے وہ مردانہ وار لڑکر احد میں شہید ہوئے۔ جیتے جی جھنڈا نہ گرنے دیا اور کفن میں ایک نامکمل چادر میسر آئی (اصابہ) ـــــ صحابہ کرام کے دور کے واقعات کہاں تک ذکر کئے جائیں یہ بزرگ حضرات تھے مرد تھے، حضرت خنساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا عورت تھیں لیکن چار بچوں کی قربانی دی۔ حضرت سمیہؓ نے اسلام میں سب سے پہلے اپنا خون پیش کیا تو بچوں کے جذبات بھی کم نہ تھے۔ بدر میں حضرت معاذؓ بن عمرو اور معاذؓ بن عفراء نے لوہے میں ڈوبے ابوجہل سے پنجہ آزمائی کی۔ حضرت رافعؓ اور حضرت جندبؓ نے مصنوعی کشتی لڑ کر جنگ میں جانے کی اجازت حاصل کی ـــــ صدر اسلام کے مسلمانوں نے جو عظیم روایت قائم کی اسے تاریخ نے ہمیشہ دہرایا۔ حضرت سعدؓ فاتح ایران کے رفقاء، حضرت عمروؓ فاتح مصر کے رفقاء، حضرت معاویہؓ کے بحری بیڑے کے مجاہدین، عقبہ بن نافعؒ، طارق بن زیادؒ، موسیٰ بن نصیرؒ اور محمد بن قاسمؒ سے لے کر تحریک مجاہدین ۱۸۳۱ء، سراج الدولہ، ٹیپو سلطان اور ۱۸۵۷ء کے شہداء، امام شامل کے ساتھی۔ سنوسی تحریک کے مجاہدین اور اب تک دینی اقدار کے لئے، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اور ظلم کو مٹانے کے لئے لڑنے والے اور راہ حق میں اپنا خون بہانے والے ـــــ اتنی تعداد میں ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے ـــــ ان سب کے کردار کو دیکھ کر جہاں حضور اقدسؐ کے ارشاد کی صداقت سامنے آتی ہے کہ "صبح قیامت تک اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خون بہانے والے برابر رہیں گے۔ یہاں تک کہ جناب مسیح علیہ السلام کی قیادت میں دنیا کے سب سے بڑے فتنے دجّال

(باقی صـ۳۱ پر)

سید شبیر حسین شاہ زاہد

تدوینِ قرآن پر اعتراضات

قرآن مجید وہ کلام الٰہی ہے جو تیرہ سال مکّہ معظّمہ اور دس سال تک مدینہ منورہ میں حضور سرور کائنات فخر موجودات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر خدائے وحدہ لاشریک کی طرف سے وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم پر جوں ہی وحی کا نزول ہوتا اسے یاد کرتے اور معاً بعد اسے لکھوا لیتے۔ یاد کرنے کی ترتیب نزول کی ترتیب سے مختلف تھی اور وہ بھی آپؐ کی ہی مقرر کردہ تھی۔ یہ سلسلہ بائیس سال سے زیادہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ آپؐ اس دنیا سے اعلیٰ علیّین کی طرف تشریف لے گئے۔ قرآن مجید اسی ترتیب کے مطابق حفظ کیا جاتا رہا جو رسالت مآبؐ نے ہدایت فرمائی تھی۔ حتیٰ کہ جنگِ یمامہ ہوئی (دورِ صدیق اکبرؓ میں) جس میں حفّاظِ قرآن کی ایک کثیر تعداد شہید ہو گئی۔ تو صدیق اکبرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو "جمع قرآن" پر مامور فرمایا۔ انہوں نے محنت شاقّہ غور و فکر، استخارہ، کئی کئی صحابہؓ سے تصدیق کر کے اور متفرق مواد (ہڈیوں، پتھروں، چمڑے وغیرہ پر لکھا ہوا تھا) سے دیکھ کر قرآن مجید کو جمع کر دیا اور یہ مصحف ابو بکر صدیقؓ کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس رہا۔ ان کی وفات پر اسے ام المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کے پاس جمع کروا دیا گیا جو خود بھی قرآن کی حافظہ تھیں۔

یہ مصحف جوں کا توں امّ المومنین حضرت حفصہ رضؓ کے پاس محفوظ رہا۔ دورِ عثمانی میں حضرت حذیفہ بن الیمان نے عربی کے تلفّظ کے سلسلے میں مشاہداتی اختلافات عرض کئے جو تلفّظِ قریش اور تلفّظِ غیر قریش (عجمی و غیر عجمی دونوں) کے درمیان تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے قرآن مجید کے صرف ایک لہجہ کے رائج کرنے کی صلاح دی جو کہ لہجۂ قریش کے مطابق ہو۔ باقی تمام لہجات کو سرکاری حکم کے ذریعے ختم کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کے مشورہ کو صائب جانتے ہوئے مصحفِ صدیقی منگوایا گیا اور اس کی کئی نقلیں کر کے بلادِ اسلامیہ

میں بھجوا دی گئیں اور حکم جاری کر دیا گیا کہ (۱) دوسرے تمام نسخے تلف کر دیئے جائیں (۲) تلاوتِ قرآن صرف لہجۂ قریش میں کی جائے یعنی سرکاری نسخے کے مطابق۔ اس وقت سے آج تک وہی قرآن مجید نقل در نقل ہم تک پہنچا ہے۔ دورِ عثمانی کے چند نسخے آج بھی موجود ہیں۔ مستشرقین اور مؤرخین نے ان کے ساتھ موجودہ نسخوں کو ملایا تاکہ اختلافات کو ہدفِ تنقید بنایا جائے مگر آخر کو وہ بھی پکار اٹھے کہ آج کا قرآن اور دورِ عثمانی کا مصحف ایک ہی چیز ہے۔

جاہلوں، منافقوں اور غیر مسلموں نے عناد کے اظہار کے طور پر تدوینِ قرآن پر اعتراضات کیے جن کا شافی و مسکت جواب دیا گیا۔ ذیل میں عیسائیوں کی طرف سے کئے گئے چند اعتراضات پر محاکمہ پیشِ خدمت ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں بھی کمی بیشی ہوئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔ اول: عبداللہ بن مسعودؓ کے نزدیک مُعَوّذتین داخلِ قرآن نہیں لیکن مصحفِ عثمانی میں ان کو داخل کر دیا گیا۔

دوئم: اہلِ تشیّع کا دعویٰ ہے کہ بعض آیات اور سورتیں خاص کر جو اہلِ بیتؑ کی شان میں تھیں مصحفِ عثمانی سے خارج کر دی گئیں۔ ان وجوہ سے یہ معترضین کہتے ہیں کہ مروّجہ قرآن جو مصحفِ عثمانی کی نقل ہے، ناقص اور محرّف ہے لیکن یہ دعویٰ بے بنیاد اور باطل ہے۔ جو کہ تحریفِ تورات و انا جیل کے ثابت شدہ الزام کی پردہ پوشی کے طور پر یہ اعتراض کیے گئے ہیں۔ جن کا ردّ درج ذیل ہے۔

اعتراض اول۔ اگرچہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں احمد اور ابن حبّان کی روایت سے یہ لکھ دیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ معوّذتین کو قرآن میں نہیں لکھتے تھے، لیکن محدّث ابن حزمؒ اپنی کتاب "قدح المعلّٰی" میں لکھتے ہیں کہ "یہ ابنِ مسعودؓ پر جھوٹا الزام ہے۔ اور یہ قول بھی موضوع ہے (کہ ابنِ مسعودؓ معوّذتین کو داخلِ قرآن نہیں سمجھتے تھے) کیونکہ ابن مسعودؓ کی جو صحیح قرأت زر کے واسطے سے عاصم نے کی ہے اس قرأت میں معوّذتین شاملِ قرآن ہیں (بحوالہ اتقان نوع ۲۲) اسی طرح علامہ ابنِ نوویؒ "مہذّب" کی شرح میں رقم طراز ہیں کہ "(معوّذتین کو داخلِ قرآن نہ سمجھنے کے سلسلے میں) ابن مسعودؓ کا جو قول نقل کیا گیا ہے وہ سراسر باطل اور غلط ہے"۔

اگر بفرضِ محال حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے معوّذتین کے داخلِ قرآن نہ ہونے

کے قول کو تسلیم کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ :

(۱) کیا حضرت ابن مسعودؓ نے اپنا نسخہ اس کامل احتیاط، خوب غور و فکر اور محنتِ شاقہ کے بعد مرتب کیا تھا، یا حضرت زیدؓ بن ثابت نے نسخہ قرآن کو زیادہ احتیاط کے ساتھ مرتب کیا تھا؟ کیا تاریخ و روایات سے اس کا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے؟

(۲) کیا مصحفِ صدیقیؓ (پھر مصحفِ عثمانیؓ) پر اس دور کے حفّاظ صحابہؓ کا اتفاق زیادہ تھا۔ یا حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے مرتّب کردہ نسخہ پر؟

(۳) کیا کاتب رسولؐ ہونے کا شرف حضرت ابن مسعودؓ کو حاصل ہے یا حضرت ابی ابن کعبؓ کو؟ (دونوں کے کاتب ہونے کی صورت میں عرصۂ کتابت کو زیرِ غور لایا جا سکتا ہے) جن سے (حضرت اُبَی بن کعبؓ) صحیح بخاری میں معوّذتین کے بارے میں یہ روایت آئی ہے کہ

ابی ابن کعبؓ سے معوّذتین کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا۔ اور آپؐ نے فرمایا تھا کہ "مجھ سے ایسا ہی کہا گیا (یعنی یہ سورتیں مجھ پر نازل ہوئی ہیں) پس میں نے یہی کہا اور اب ہم وہی کہتے ہیں جو ہم سے رسولؐ اللہ نے فرمایا"۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سورتوں کو نماز میں پڑھا۔ بیماری کی حالت میں اکثر پڑھا۔ بعض آدمی سمجھے کہ یہ ردِّ سحر کی دعائیں ہیں لیکن یہ ان کی غلطی تھی۔ بزاز سے یہ منقول ہے کہ "حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آخر میں اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا"۔ (بحوالہ تیسیر القاری جلد چہارم) شیعوں کی مشہور کتاب "حدیث الکافی" میں ہے کہ

"حضرت امام جعفر صادقؒ سے روایت ہے کہ آپ سے معوّذتین کے متعلق کہ یہ داخلِ قرآن ہیں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں! وہ شاملِ قرآن ہیں۔ ایک شخص کہنے لگا کہ ابن مسعودؓ کی قرأت میں داخلِ قرآن نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ابن مسعودؓ نے غلطی کی"۔

تسمیہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کے سورتوں کے آغاز میں بطور نشانی لکھے اور پڑھے جانے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ معوّذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) ایک ہی دفعہ نازل ہوئیں۔ ان میں فرق محسوس نہ کیا جا سکا اور ان دونوں سورتوں کو ایک ہی سمجھ لیا گیا۔ بعد

میں جب صحیح صورتحال کا انکشاف ہوا تو ان میں فرق کیلئے (خاص طور پر) اور دوسری قرآنی سورتوں کے آغاز میں بطور نشانی کے تسمیہ کا تحفہ عطا ہوا۔ روایت ہے کہ اس موقعہ پر تسمیہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کو بطور خاص ستر ہزار فرشتوں کے جلو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا گیا۔

کیا ان واضح دلیلوں کے بعد بھی عیسائی معترضین اپنے الزام پر اصرار کریں گے، لیکن اگر اب بھی ان کا ضدی پن اور جحود برقرار رہے تو ان کیلئے یہ بات کافی ہے کہ معوّذتین کے ابن مسعودؓ کے انکار سے عیسائیوں کو کوئی فائدہ نہیں اس لئے کہ ان میں تثلیث کا ردّ مذکور نہیں ہے۔ ہاں! جن آیات میں تثلیث والوہیتِ مسیح کا ردّ مذکور ہے۔ اگر ان کو ابن مسعودؓ کے حوالے سے پیش کریں تو کوئی بات ہو سکتی ہے۔

اعتراض دوم۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کا نتیجہ شہادت علی مرتضیٰؓ، حضرت امام حسنؓ کی خلع خلافت اور بنی امیّہ کی حکومت کی شکل میں ظاہر ہوا تو جھوٹی روایات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ شیعانِ علیؓ بنی امیّہ کے ساتھ ساتھ خلفائے ثلاثہ راشدہ اور متعدّد صحابہ کرام کو مطعون کرنے لگے۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو قرآن مجید کے ایک متفق علیہ نسخہ اور ایک لہجہ پر جمع کر کے اور تحریف و تبدیل سے بچا کر دین کی ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دی، مگر عداوت کی آنکھ میں اُن کی یہ خدمت اُن کا عیب بن گیا۔ ان پر کلام پاک کی تدوین کے سلسلے میں طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ بے سروپا روایات گھڑی گئیں۔ اور اس قرآن کو جس کی حفاظت کا وعدہ (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ) خدا تعالیٰ نے خود فرمایا ہے، صرف عداوتِ عثمانؓ کی وجہ سے آئندہ نسلوں کے لئے مشکوک کرنے کی کوشش کی گئی اور غیروں کو جگ ہنسائی کا موقع فراہم کیا گیا۔

اہل سنّت کی بعض کتبِ حدیث میں مثلاً طبرانی و بیہقی، جن کو حضرت شاہ ولی اللہؒ تیسرے درجہ کی کتب احادیث میں شمار کرتے ہیں، اس قسم کی روایات کو بغیر تنقید کے بجنسہٖ نقل کر دیا گیا۔ جن کے راوی شیعہ ہیں۔ مثلاً طبرانی کتاب الدّعا میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ (راوی کہتا ہے):

"مجھ سے عبدالملک بن مروان نے یہ بات کہی کہ تو کس وجہ سے ابو تراب (حضرت

علیؓ) کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ وہ تو بس ایک خشک دماغ دیہاتی شخص ہے۔ " میں نے کہا " واللہ میں نے اس وقت میں قرآن کو جمع کیا جبکہ تیرے ماں باپ اکٹھے بھی نہ ہوئے تھے اور اس قرآن میں سے علی ابن ابی طالبؓ نے دو سورتیں مجھ کو سکھائی تھیں۔ جو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر تعلیم کی تھیں۔ اور وہ سورتیں ایسی ہیں جن کو نہ تو نے سیکھا ہے اور نہ تیرے باپ نے ان کی تعلیم پائی تھی۔ وہ سورتیں یہ ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنُثْنِیْ عَلَیْکَ وَلَا نَکْفُرُکَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَفْجُرُکَ۔ اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ اِلَیْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ۔ (یہ دعائے قنوت ہے)

مذکورہ بالا روایت میں پانچ راوی ہیں۔ (۱) عباد بن یعقوب کو علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں غالی شیعہ اور رؤس بدعت لکھا ہے۔ (۲) یحییٰ بن یعلیٰ اسلمی کو میزان الاعتدال میں مضطرب الحدیث لکھا گیا ہے۔ باقی تین راویوں کے بارے میں بھی اسقام کا محدثین نے اظہار کیا ہے۔ اب اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس روایت کو مان لیں تو صورتِ حال کچھ یوں بنتی ہے کہ راوی یعنی عبداللہ بن زریر الغافقی نے حضرت علیؓ سے دعائے قنوت سیکھی۔ اور اسے عبدالملک کے سامنے پڑھا، لیکن اخیر راوی عباد بن یعقوب نے (جو غالی شیعہ تھا اور قرآن میں حذف و اضافہ کا قائل تھا) دعا کی بجائے اسے سورۃ کہہ دیا حالانکہ یہ پوری عبارتیں دعائے قنوت سے ماخوذ ہیں۔ جو آج تک نمازِ عشاء کے وتروں میں پڑھے جاتے ہیں، لیکن ان کو کبھی داخلِ قرآن نہیں سمجھا گیا۔ ہاں! یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے اس دعا کو اجزائے قرآن کے ساتھ لکھ لیا ہوگا۔ اس لئے کئی لوگوں کو اس کے شاملِ قرآن ہونے کا دھوکہ ہوگیا۔ اور پھر یار لوگوں نے دوسرے تمام حقائق کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے تحریفِ قرآن کے نظریہ کا پرچار کیا۔ جیسا کہ مصحف اُبیؓ بن کعب کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس میں الحفد اور نخلع نامی دو سورتیں تھیں۔ حالانکہ نحفد اور نخلع کے جو الفاظ دعائے قنوت میں مذکور ہیں انہیں میں سے یہ دو سورتوں کے نام تراش لئے ہیں۔ سورتوں کی عبارت بھی دعائے قنوت والی ہے۔

محمد بن یعقوب الکلینی (مشہور شیعہ عالم) نے اپنی حدیث کی کتاب " کافی " میں

اس قسم کی روایتیں درج کی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں حضرت علیؓ کا نام اور اہل بیت کا ذکر تھا وہ مقامات کلام پاک سے خارج کر دیئے گئے۔ ان روایات کو علی بن ابراہیم القمی نے اپنی تفسیر "القمی" میں آب و تاب سے بیان کیا۔ پھر لکھ دیا کہ صحیح کلام مجید وہ ہے جس کو حضرت علیؓ نے جمع فرمایا تھا۔ اب وہ امام غائب یعنی بارہویں امام مہدی علیہ السلام کے پاس موجود ہے جو کہ اس کے ظہور کے ساتھ ہی آئے گا۔ (مقدمہ تفسیر صافی)

بعض نے کہا کہ اصل قرآن مجید چالیس سپاروں پر مشتمل تھا جسے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بکری کھا گئی بعض شیعہ علماء کے پاس اب بھی ایسی آیات پائی جاتی ہیں، جو اُن کے خیال میں اصل قرآن مجید میں موجود تھیں، مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے تدوینِ قرآن کے وقت انہیں حذف کر دیا۔ کئی شیعہ مؤرخوں اور علماء نے لکھا ہے کہ "اصل قرآن مجید کے آنے تک موجودہ قرآن مجید کے مطابق ہی زندگی گزارنا ضروری ہے۔" لیکن قرآن مجید کے بارے میں شیعہ حضرات کے یہ عقائد درج ذیل وجوہ سے لغو اور بے اصل قرار پاتے ہیں۔

(۱) چالیس سالہ دورِ خلافت راشدہ (جس میں پانچ سال حضرت علیؓ کی اپنی خلافت کے ہیں) میں حضرت علیؓ نے اصل قرآن کی نشاندہی کیوں نہ کی۔

(۲) دورِ صدیقیؓ، فاروقیؓ اور عثمانیؓ میں آپؓ نے دوسرے معاملات میں خلفاء اور صحابہ سے اختلاف کیا۔ تدوینِ قرآن کی تحریف پر کیوں آواز بلند نہ کی۔

(۳) مختلف مواقع پر جہاں بھی حضرت علیؓ نے (فیصلوں میں اپنے دعاوی کے ثبوت میں وغیرہ) قرآن کو پیش کیا اسی موجودہ قرآن کو پیش کیا۔ اُس وقت آپ نے اصل کلام پاک کا تذکرہ کیوں نہ کیا؟

(۴) روایات سے یہ بات ضرور مذکور ہے کہ حضرت علیؓ نے قرآن مجید (یا اس کے کچھ اجزاء) اپنی تلوار کی میان میں رکھے ہوئے تھے۔ مگر کیا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ قرآن یا اجزاء مصحفِ صدیقیؓ سے مختلف تھے؟

(۵) حضرت علیؓ اور اولادِ علیؓ دوسرے معاملات اور سیاسی بدعنوانیوں پر حکمرانوں سے ٹکر لے سکتے ہیں، سر کٹوا سکتے ہیں، مگر ان کی آنکھوں کے سامنے قرآن میں تحریف ہو رہی ہے اور وہ خاموش ہیں۔ کیوں؟ اگر یہ خاموشی بر بنائے "تقیہ" ہے تو کیا یہ تقیہ بزدلی اور ایمان سے محرومی کی علامت نہیں۔ جبکہ علیؓ و اولاد علیؓ کے نقشِ قدم "ایمان" کے درجات کی

طرف نشاندہی کرتے ہیں۔

اب ان محققین علماءِ شیعہ کے اقوال پیش خدمت ہیں جنہوں نے حذف و اضافۂ قرآن والی روایتوں پر خود کلام کیا ہے۔ علامہ ابو علی الطبرسی لکھتے ہیں۔

" انہیں میں سے ایک بحث یہ ہے کہ قرآن مجید میں زیادتی یا کمی ہوئی یا نہیں۔ یہ بحث فن تفسیر سے متعلق ہے۔ یہ امر کہ قرآن میں کچھ زیادتی ہوئی، سب کے نزدیک باطل ہے۔ باقی رہا نقصان، تو ہماری جماعت میں سے ایک گروہ نے اور سُنّیوں نے حشویہ سے روایت کیا ہے کہ قرآن میں تغیّر اور نقصان ہو گیا ہے، لیکن ہمارے فرقہ کا صحیح مذہب اس عقیدہ کے خلاف ہے اور سید مرتضیٰؒ نے اسی کی تائید کی ہے۔ اور مسائل طبریات کے جواب میں اس پر نہایت مفصل بحث کی ہے۔ سید مرتضیٰ نے متعدد مواقع پر لکھا ہے کہ قرآن کی صحت کا علم ایسا ہی ہے جیسا شہروں کا علم اور بڑے بڑے واقعات اور مشہور کتابوں اور عرب کے مدوّن اشعار کا علم۔ کیونکہ قرآن کی نقل اور حفاظت کے اسباب کثرت سے تھے۔ اور اس حد تک پہنچے تھے کہ کسی اور چیز کے سنے نہیں گئے۔ اس لئے کہ قرآن نبوت کا معجزہ اور علوم شرعیہ اور احکامِ دینیہ کا ماخذ ہے۔ اور علمائے دین نے اس کی حفاظت اور حمایت میں انتہا درجہ کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ قرآن کے اعراب، قرأت، حروف و آیات کے اختلافات تک انہوں نے محفوظ رکھے۔ اس لئے کیوں کر قیاس ہو سکتا ہے کہ اس احتیاط شدید کے ہوتے ہوئے اس میں نقصان یا تغیّر آنے پائے۔ اور سید مرتضیٰؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلعم کے زمانہ میں مکتوب اور حافظوں میں مرتب تھا، جیسا اب ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ قرآن اس زمانے میں پڑھا جاتا تھا اور لوگ اس کو حفظ کرتے تھے۔ اور نبیؐ کو سناتے تھے اور متعدد صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ وغیرہ نے قرآن کو آنحضور صلعم کے سامنے چند بار ختم کیا تھا۔ ان سب باتوں پر غور کرنے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن مکمل اور مرتب تھا۔ علامہ طبرسی نے بھی کہا ہے کہ جو امامیہ یا حشویہ اس (قرآن) کے مخالف ہیں، ان کی مخالفت قابل اعتبار نہیں کیونکہ اس میں جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے وہ اہل حدیث میں سے ایک گروہ ہے اور انہوں نے ضعیف روایتیں نقل کی ہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ قرآن جس کو خدا نے اپنے نبیؐ پر اتارا ہے، وہی ہے جو دفتین کے درمیان تھا۔ اور جو لوگوں کے پاس ہے اُس سے کچھ زائد نہیں ہے۔ جو لوگ ہماری

طرف نسبت کرتے ہیں کہ قرآن ' موجودہ قرآن سے زیادہ تھا وہ جھوٹے ہیں۔" (تفسیر مجمع البیان جلد اول)

قاضی نور اللہ شوستری اگرچہ خلفائے ثلاثہ کو سختی سے مورد لعن وطعن ٹھہراتے ہیں ' مگر کلام مجید کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ

" شیعہ امامیہ کی طرف یہ بات جو منسوب کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں تغیر ہوا ہے ' جمہور امامیہ اس کے قائل نہیں ہیں۔ اس کا قائل صرف ایک چھوٹا سا گروہ ہے ' جو کسی شمار میں نہیں۔" (مصائب۔ النواصب)

درج بالا شیعہ فرقہ کے چوٹی کے علماء کے اقتباسات کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تحریفِ قرآن کا نظریہ رکھنے والوں کو قاضی نور اللہ شوستری کسی شمار میں نہیں رکھتے۔ رئیس المحدثین محمد بن علی بابویہ القمی کتاب الاعتقادات میں ایسے لوگوں کو کاذب قرار دیتے ہیں۔ علامہ طبرسی انہیں ناقابل اعتبار اور باطل قرار دیتے ہیں۔ اور جو نظریہ رکھتے ہیں یا جو اس نظریہ والوں کو اپنے دعویٰ (تحریفِ قرآن) کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں انہوں نے بھی اپنے زعمِ باطل کے ثبوت میں کسی زمانہ میں بھی کسی شیعہ ' کسی ولی ' کسی امام ' کسی صحابیؓ وغیرہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ قرآن آج تک پیش نہ کیا۔ تمام گروہوں اور فرقوں کا ' خواہ وہ معاندینِ صدیقؓ ہوں یا مخالفینِ عثمانؓ ' اسی مصحفِ عثمانیؓ پر اتفاق ہے جو مصحفِ صدیقیؓ کی نقل ہے۔

مخالفینِ اسلام کا یہ بھی خیال ہے کہ "قرآن کی ترتیب میں کوئی خوبی نہیں۔ پہلے بڑی سورتیں ' پھر چھوٹی سورتیں جمع کر دی گئی ہیں۔" اس سوال کا جواب دینے سے قبل ہم سورتوں کی ترتیب پر تھوڑا سا غور کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب اس طرح ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے بعد پہلے سبع طوال یعنی سات بڑی سورتیں (بقرہ۔ آل عمران۔ نساء۔ مائدہ۔ انعام۔ اعراف۔ انفال) ہیں۔ اس کے بعد مئین یعنی وہ سورتیں جن میں کم و بیش ایک سو آیات ہیں (سورۃ یونس سے سورۃ فاطر تک) پھر مثانی ' جن میں قصص و نصائح کی تکرار ہے۔ اور یہ سورتیں سو آیتوں سے کم ہیں۔ (سورۃ یٰسٓ سے قٓ تک) پھر مفصل یعنی چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں۔ (سورۃ قٓ سے سورۃ ناس تک) اس طرح کل ایک سو چودہ سورتیں بنتی ہیں۔ یہ ترتیب "ترتیب نبویؐ" ہے۔ اب اگر اس ترتیب پر غور کیا جائے اور

معترضین کی بات کو درخود اعتنا سمجھا جائے، تو سوال یہ ہے کہ مئین (ایک سو آیات والی سورتیں) میں سورۃ رعد جس میں صرف ۴۳ آیات ہیں، سورۃ ابراہیم جس میں ۵۲ آیات ہیں سورۃ نور جس میں ۶۴ آیات ہیں، شامل کر دی گئی ہیں۔ جبکہ ان کو مثانی (قصص و نصائح کی تکرار اور ایک سو آیات سے کم طوالت) میں ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح مثانی میں شامل سورۃ الصافات کو، جس میں ۱۸۲ آیات ہیں، ترتیب کے مطابق مئین میں ہونا چاہئے تھا۔

دوسری طرف ترتیبِ ابن مسعودؓ اور ترتیب علیؓ مرتضیٰ جو ایک دوسری سے مخالف اور انفرادی (ترتیب میں) تھیں، پسند نہیں کی گئیں۔ حضرت علیؓ کی ترتیب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں شانِ نزول کے لحاظ سے سورتیں جمع تھیں۔ بے شک تاریخی حیثیت سے یہ ترتیب بہت مناسب تھی، لیکن اکثر ایک ہی وقت میں پوری پوری سورۃ نازل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے یکے بعد دیگرے مکمل سورتیں جمع نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؓ نے اس ترتیب سے رجوع کر کے ترتیبِ "عثمانی" کو جو دراصل ترتیبِ نبوی ہی تھی، اپنے عہد میں جاری رکھا جو کہ اجماعِ صحابہؓ سے وجود میں آئی تھی۔ اور یہی ترتیب عثمانیؓ (دراصل ترتیب نبویؐ) ہے، جو آج تک مروّج ہے اور قیامت تک مروّج رہے گی۔ اور مخالفین اپنے غیظ و غضب اور آتشِ حسد میں خود جلتے رہیں گے۔

بقیہ : شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

کا قلع قمع ہوگا"۔۔۔ وہاں اقبال کے شعر کی صداقت الم نشرح ہو جاتی ہے کہ۔

؎ شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

اللھم ارزقنا شھادۃ فی سبیلک واعف عنا واغفرلنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین واغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولاتجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور فلسفۂ تاریخ

تاریخ کے ناقص فلسفے

انسانی افراد اور جماعتوں کے افعال کے سلسلہ کو انسانی تاریخ کہتے ہیں لیکن کیا انسانی اعمال جن سے تاریخ کا تار و پود بنتا ہے کسی قاعدے یا قانون کے پابند ہیں، کیا ان کا کوئی مقصد ہے کیا ان کی کوئی سمت یا منزلِ مقصود ہے۔ اگر ہے تو وہ کیا ہے۔ قومیں اور تہذیبیں کیوں اُبھرتی ہیں، کیوں مٹتی ہیں۔ کیا ان کے عروج و زوال کا کوئی اصول ہے۔ کیا کوئی قوم یا کوئی تہذیب ایسی بھی ہو سکتی ہے جو قوموں اور تہذیبوں کو مٹانے والے عوامل کی زد سے محفوظ رہ سکتی ہو اور ارتقائے عالم کی منزلِ مقصود ہو۔ اس قوم کے اوصاف اور امتیازات کیا ہوں گے۔ کیا ہم ایسی قوم کو وجود میں لا سکتے ہیں، کیا ہم اپنے آپ کو ایسی قوم بنا سکتے ہیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ بہت سے فلسفیوں نے جن میں ڈینی لیوسکی (DENILEVSKY) سپنگلر (SPENGLER) ٹائنبی (TOYNBEE) اور سوروکن (SOROKIN) زیادہ مشہور ہیں، اپنی بالعموم غیر معمولی اور غیر ضروری طوالت کی تصنیفات میں اس قسم کے بعض سوالوں کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے، لیکن اُن کے جوابات مبہم اور غیر واضح اور اُلجھے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ انسان کے اعمال انسان کی فطرت سے سرزد ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب تک پہلے انسان کی فطرت کا ایک معقول اور صحیح نظریہ پیدا نہ کیا جائے، تاریخ کے واقعات کے پیچھے جو قوانینِ قدرت کام کر رہے ہیں اُن کو سمجھنا ممکن نہیں۔ تاریخ سب سے پہلے فردِ انسانی کی فطرت کے اندر جنم لیتی ہے۔ فردِ انسانی کے اعمال قوموں اور تہذیبوں کی تاریخ کی اکائی (UNIT) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک اس اکائی کو نہ سمجھا جائے ممکن نہیں کہ ہم ان بڑے بڑے مجموعوں

کو سمجھ سکیں جو اس اکائی سے صورت پذیر ہوتے ہیں۔ اور فردِ انسانی کی فطرت کو سمجھنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی شخصیّت کی گاڑی کے ڈرائیور کو یعنی اُس کے افعال کی اندرونی قوّتِ محرکہ کو سمجھا جائے۔ جب تک ہمیں اس قوّت کا علم نہ ہو ممکن نہیں کہ ہم معلوم کر سکیں کہ وہ کون سا قانونِ قدرت ہے جو انسان کے اعمال کو ضبط میں رکھتا ہے اور اُن کی سمت اور منزل معیّن کرتا ہے اور قوموں کے عروج وزوال کے اسباب پر حاوی ہے۔ فلسفۂ خودی کی رُو سے انسان کے اعمال کی قوّتِ محرکہ سچّے خدا کی محبّت ہے اور یہی وہ قوّت ہے جو افراد کو متحد کر کے ایک قوم کی شکل دیتی ہے۔ جب کوئی قوم سچے خدا سے محبّت نہ کر سکے تو وہ اُس کی بجائے کسی اور تصوّر کو جس کی طرف وہ حُسن وکمال کے اوصاف منسوب کر سکتی ہو، اپنا نصب العین بنا لیتی ہے۔ اور پھر اُسی سے محبّت کرتی ہے اور اپنے سارے اعمال کو اُس کی محبّت کے تابع کر دیتی ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب وہ محسوس کرتی ہے کہ اُس میں حُسن وکمال کے اوصاف درحقیقت موجود نہیں، وہ مجبور ہوتی ہے کہ اُس کی محبّت سے رجوع کرے یہاں تک کہ اُسے بالکل ترک کر دے اور جب یہ نوبت آتی ہے تو قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔

تاریخِ عالم کے چار ادوار

تاریخ کے ان فلسفیوں کی ایک اور غلطی یہ ہے کہ انہوں نے انسانی تاریخ کو کائنات کی باقی تاریخ سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ انسانی تاریخ مجموعی تاریخِ عالم کا ایک دَور ہے جو اُس کے پہلے ادوار سے بے تعلّق نہیں ہو سکتا، بلکہ ضروری ہے کہ وہ اُن کے ساتھ ہم آہنگ اور مسلسل ہو۔

ایچ۔ جی۔ ویلز (H.G.WELLS) نے اپنی عالمی تاریخ کی کتاب "تاریخ کا خاکہ" (Outline of History) کو بجا طور پر ابتدائے آفرینش سے شروع کیا ہے اور اُس نے اپنے اس مؤقف کی تائید کے لیے فریڈرک راٹزیل (FRIEDRICH RATZEL) کا یہ نہایت ہی گہرا اور دانشمندانہ قول اپنی کتاب کے شروع میں نقل کیا ہے کہ "نوعِ انسانی کی تاریخ کا فلسفہ جو فی الواقع اس نام کا مستحق ہو اس یقین سے پُر ہونا چاہیے کہ ہستی تمام کی تمام ایک وحدت ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور فلسفۂ تاریخ

تاریخ کے ناقص فلسفے

انسانی افراد اور جماعتوں کے افعال کے سلسلہ کو انسانی تاریخ کہتے ہیں لیکن کیا انسانی اعمال جن سے تاریخ کا تار و پود بنتا ہے کسی قاعدے یا قانون کے پابند ہیں، کیا ان کا کوئی مقصد ہے کیا ان کی کوئی سمت یا منزلِ مقصود ہے۔ اگر ہے تو وہ کیا ہے۔ قومیں اور تہذیبیں کیوں اُبھرتی ہیں، کیوں مٹتی ہیں۔ کیا ان کے عروج و زوال کا کوئی اصول ہے۔ کیا کوئی قوم یا کوئی تہذیب ایسی بھی ہو سکتی ہے جو قوموں اور تہذیبوں کو مٹانے والے عوامل کی زد سے محفوظ رہ سکتی ہو اور ارتقائے عالم کی منزلِ مقصود ہو۔ اس قوم کے اوصاف اور امتیازات کیا ہوں گے۔ کیا ہم ایسی قوم کو وجود میں لا سکتے ہیں، کیا ہم اپنے آپ کو ایسی قوم بنا سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ بہت سے فلسفیوں نے جن میں ڈینی لیوسکی (DENILEVSKY) سپنگلر (SPENGLER) ٹائنبی (TOYNBEE) اور سوروکن (SOROKIN) زیادہ مشہور ہیں، اپنی بالعموم غیر معمولی اور غیر ضروری طوالت کی تصنیفات میں اس قسم کے بعض سوالوں کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے، لیکن اُن کے جوابات مبہم اور غیر واضح اور اُلجھے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ انسان کے اعمال انسان کی فطرت سے سرزد ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب تک پہلے انسان کی فطرت کا ایک معقول اور صحیح نظریہ پیدا نہ کیا جائے، تاریخ کے واقعات کے پیچھے جو قوانینِ قدرت کام کر رہے ہیں اُن کو سمجھنا ممکن نہیں۔ تاریخ سب سے پہلے فردِ انسانی کی فطرت کے اندر جنم لیتی ہے۔ فردِ انسانی کے اعمال قوموں اور تہذیبوں کی تاریخ کی اکائی (UNIT) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک اس اکائی کو نہ سمجھا جائے ممکن نہیں کہ ہم ان بڑے بڑے مجموعوں

وہ ایک ہی تصوّر ہے جو شروع سے آخر تک یکساں رہنے والے ایک ہی قانون پر قائم چلا آتا ہے۔ فلسفۂ تاریخ کے متعلق یہ نقطۂ نظر بالکل درست ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ارتقائے عالم ایک واحد اور مسلسل عمل ہے جو شروع سے آخر تک ایک ہی مقصد رکھتا ہے اور ایک ہی منزل کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ اور جیسا کہ ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں، اس عمل کو حرکت دینے والی قوّت بھی ایک ہی ہے، اور وہ خدا کا ارادۂ تخلیق یعنی خود خدا ہے۔ اس عمل کا آغاز کائناتی شعاعوں سے ہوا تھا اور اس کے پہلے بڑے دَور میں مادی کائنات ترقی پا کر تکمیل کو پہنچی تھی۔ کائنات کی مادّی تکمیل کا مقصد یہ تھا کہ مادہ اس حالت کو پالے جو زندگی کے ظہور کے لیے سازگار ہو۔ چنانچہ مادہ کی تکمیل کے ساتھ ہی زندگی کا نمایاں ظہور سب سے پہلے ایک خلیہ کے حیوان میں ہوا اور اس واقعہ سے تاریخِ عالم کا دُوسرا بڑا دَور شروع ہوا جس کے اختتام پر کائنات کی حیاتیاتی تکمیل عمل میں آئی۔ کائنات کی حیاتیاتی تکمیل کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا جسمِ حیوانی وجود میں آئے جس میں خدا کی محبّت کا جذبہ اُس کے سارے اعمال کی قوتِ محرکہ کے طور پر نمودار ہو، چنانچہ زندگی کے کروڑوں برس کے ارتقاء کے بعد یہ جسمِ حیوانی وجود میں آیا اور یہی انسان ہے۔ پہلے انسان کے ظہور سے تاریخِ عالم کا تیسرا بڑا دَور شروع ہوتا ہے جسے انسانی تاریخ کا پہلا دَور کہنا چاہیے۔ اس دَور میں ارتقا کی قوتیں زمین کے گوشہ گوشہ میں اَن گنت انبیاء پیدا کر کے انسان کی نظریاتی تکمیل کے لیے کارفرما ہیں۔ اِس دَور کا مقصد یہ تھا کہ آخر کار ایک نبیٔ کامل یا رحمۃ للعٰلمینؐ کا ظہور ہو، جس کی نظری تعلیم اور عملی زندگی کی مثال میں خدا کی محبّت کا جذبہ انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر حاوی ہو جائے اور جو اس طرح سے نوعِ انسانی کو ایک ایسا کامل نظریۂ حیات بہم پہنچائے جو انسان کی اخلاقی، سیاسی، رُوحانی، تعلیمی، قانونی، اقتصادی، علمی اور فنی ترقیوں کو نقطۂ کمال پر پہنچا سکے۔

نبیٔ کامل یا رحمۃ للعٰلمینؐ کے ظہور سے انسانی تاریخ کا دوسرا دَور اور تاریخِ عالم کا چوتھا اور آخری دَور شروع ہوتا ہے اور وہ اس وقت ختم ہوگا جب نوعِ انسانی اپنے کمال کو پہنچے گی۔ اُمّتِ مسلمہ یا نبیٔ کاملؐ کی اُمت تاریخِ عالم کے تیسرے اور چوتھے ادوار یعنی تاریخِ انسانی کے پہلے اور دوسرے ادوار کے وسط میں نمودار ہوئی ہے، تاکہ وہ نوعِ انسانی کی قیادت کی صلاحیتوں سے

بہرہ ور ہو سکے، تاکہ ایک طرف سے وہ نبیؐ کامل کی وساطت سے تمام گزشتہ انبیاء کی تعلیمات کے کمال کی حامل بن جائے اور دوسری طرف سے اپنے اس امتیاز کی وجہ سے نوعِ انسانی کی آنے والی نسلوں کے لیے اُسی طرح سے کامیاب راہ نما بنے (لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) جس طرح سے نبیؐ کامل اُس کے کامیاب راہ نما بنے ہیں (وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا)۔ اِسی لیے قرآن حکیم نے اُمّتِ مسلمہ کو اُمّۃً وسطاً کہا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ تاریخِ عالم کے چار واقعات نہایت عظیم الشان ہیں۔ ایک تو وہ جب تخلیقِ عالم کا آغاز ہوا اور کائناتی شعاعیں یکایک "فاصلہ۔ وقت" کے ایک بحرِ ناپیدا کنار کے اندر دوڑنے لگیں۔ دُوسرا وہ جب سمندروں کے کنارے کیچڑ میں کہیں پہلا ایک خلیہ کا جاندار نمودار ہُوا۔ تیسرا وہ جب پہلا مکمل جسمِ انسانی اپنے پہلو میں خدا کی محبّت کا ایک طوفان لے کر ظہور پذیر ہوا اور چوتھا وہ جب ایک رحمۃ للعالمینؐ کی نظری تعلیم و عملی زندگی کے نمونہ میں وہ مکمل نظریۂ زندگی نمودار ہوا جو اپنے اندر انسان کو اس کی ہر نوع کی ترقی کے نقطۂ کمال تک پہنچانے کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ ان میں سے ہر واقعہ ایک دَور کا آغاز کرتا ہے جو اگلے دَور کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور اُس کی آمد کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے، یہاں تک کہ آخری دَور آجاتا ہے۔ لہٰذا انسانی ادوار کی تاریخ حیاتیاتی اور مادّی ادوار سے بے تعلق نہیں۔

کارل مارکس (KARL MARX) نے بھی ایک فلسفۂ تاریخ دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کا فلسفۂ تاریخ فطرتِ انسانی کے غلط نظریہ پر مبنی ہے اور ارتقائے عالم کے بنیادی سبب کو بھی نظر انداز کرتا ہے۔ لہٰذا وہ از سرتاپا غلط ہو کر رہ گیا ہے۔

خودی کی تکمیل اور انسان کا شاندار مستقبل

کیا انسان فی الواقع اپنے حسن و کمال کی انتہا کو پہنچے گا؟ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ اقبال کہتا ہے کہ یہ سوال ہم سے نہ پوچھو بلکہ معنیٔ آدم یعنی انسان کی فطرت پر نگاہ ڈالو جس میں حسن و کمال خداوندی کی محبت کا ایک بے پناہ، ناقابلِ التوا اور ناقابلِ مزاحمت جذبہ رکھ دیا گیا ہے۔ یہ جذبہ ہر حالت میں اپنی تشفّی پا کر رہے گا اور جب تشفی پائے گا تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور

کچھ نہیں ہوگا کہ انسان خدا کی محبّت یعنی تفکّر فی الصّفات (عبادت) اور حسنِ عمل کے ذریعہ سے صفاتِ خداوندی کے حسن کو جذب کر کے اپنے حسن کی انتہا تک پہنچے گا۔ اس وقت انسان جو اب اپنے گوناگوں نقائص کی وجہ سے مصرعِ ناموزوں کی طرح دلوں میں کھٹک رہا ہے ان نقائص سے پاک ہو کر مصرعِ موزوں کی طرح حسین اور دل کش ہو جائے گا۔ اُس وقت اس کی مشتِ خاک فرشتوں سے بھی زیادہ مقدّس اور منوّر ہو جائے گی اور اس کی تقدیر کا کوکبِ سعادت زمین کو اخلاقی، علمی، جمالیاتی اور روحانی طور پر بلند اور روشن کر کے گویا آسمان کا مقام دے گا۔

فروغِ مشتِ خاکِ نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ او گردوں شود روزے
یکے در معنیٔ آدم نگر از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت مے خلد موزوں شود روزے

قارئینِ کرام!

- آپ کا زرِ تعاون ختم ہونے کی تاریخ لفافے پر چسپاں نام و پتہ کے لیبل پر درج ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ مذکورہ تاریخ اگر گزر چکی ہو تو ہمیں جلد از جلد مطلع فرمائیں کہ آپ کے نام پرچہ بدستور جاری رکھا جائے! اِس مقصد کے لیے الگ سے یاد دہانی کے خطوط ارسال نہیں کیے جا رہے۔
- بیرونِ ملک قیام پذیر حضرات سے گذارش ہے کہ جہاں ممکن ہو اپنے پرچے الگ الگ ناموں سے منگوانے کے بجائے کسی ایک نام سے اکٹھے منگوا کر باہم تقسیم کا انتظام فرمائیں۔
- سالانہ اجتماع کے موقعہ پر کتب/کیسٹس خریدنے کے خواہشمند حضرات اگر پیشگی بذریعہ ڈاک اپنی مطلوبہ کتب/کیسٹس کی فہرست ہمیں ارسال کر سکیں تو ہمارے لیے سہولت کا باعث ہوگا۔

شکریہ!

لغات واعرابِ قرآن (۱۰)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرہ (۵)

(ملاحظہ! کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس کی وضاحت مقدمہ (حکمت قرآن فروری ۸۹ء) میں کردی گئی تھی۔ جن حضرات کی نظر سے وہ شمارہ نہیں گزرا۔ ان کے لیے دوبارہ اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ [قطعہ بندی کے لیے سب سے پہلا دائیں طرف والا ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد اگلا دائیں طرف والا قطعہ نمبر (جو اس سورۃ میں سے زیر مطالعہ ہے) کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد تیسرا نمبر بحث اللغۃ کے لیے ۱، بحث الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ لکھا گیا ہے مثلاً ۱:۳:۲ کا مطلب ہے سورۃ الفاتحہ کے تیسرے قطعہ میں بحث الاعراب]۔

۲:۵ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

۲:۵:۱ اللغۃ

[اِنَّ] یہ حرف مشبہ بالفعل ہے جو اپنے اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے۔ بلحاظِ معنی یہ حرف تاکید ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ "بےشک" یا "یقیناً" فارسی میں "ہرآئینہ" اور انگریزی میں VERILY, CERTAINLY سے کیا جاتا ہے۔

[اَلَّذِیْنَ] پر الفاتحہ: ۷ (۱:۶:۱) میں بات ہو چکی ہے یہاں اس کا ترجمہ "وہ لوگ جو کہ"، "جنہوں نے کہ"، یا صرف "جو کہ" سے بھی ہو سکتا ہے

۲ : ۵ : ۱ (۱) [كَفَرُوْا] کا مادہ " ک ف ر " اور وزن " فَعَلُوْا " ہے۔
اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرّد کفَر ...... یَکفُرُ کُفْرًا (باب نصر سے) ہمیشہ متعدّی آتا ہے صلہ کے بغیر بھی اور باء (بِ) کے صلہ کے ساتھ بھی ۔

● جب یہ فعل بغیر صلہ کے آئے تو اس کے بُنیادی معنی " چھپا دینا " ہوتے ہیں ۔ مثلاً کفَر الشَّیْئَ = ستَرہ وغَطَّاہُ = "...... کو چھپا دینا ۔ ڈھانپ دینا " ۔ اور ان ہی معنی کی بنا پر لفظ " کافر " عربی زبان میں اندھیری رات ۔ سمندر اور کسان وغیرہ کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے

● پھر اسی سے اس فعل میں " ناشُکری کرنا " اور " بے قدری کرنا " کے معنی پیدا ہوتے ہیں ۔ اور ان معنی کے لیے یہ (فعل) صلہ کے ساتھ بھی اور صلہ کے بغیر بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً کفَر نِعْمَۃَ اللّٰہِ یا کفَر بِنِعْمَۃِ اللّٰہِ = اللہ کی نعمت کی ناشکری کرنا ۔

● پھر اس " ناشکری " سے ہی اس فعل میں " کسی چیز کو قبول کرنے یا ماننے سے انکار کرنا " کا مفہوم پیدا ہوتا ہے ۔ تاہم ان معنوں (انکار کرنا) کے لیے یہ فعل بالعموم صلہ (بِ) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے ۔ اور صلہ کے بعد مفعول مذکور ہوتا ہے یعنی کفَر بِ ...... = ... کا انکار کرنا ۔ ...... کو نہ ماننا ۔ مثلاً کفَر باللّٰہ = اس نے اللہ کا انکار کیا ۔ اردو میں اس کے لیے " ...... سے کفر کرنا " بھی استعمال ہوتا ہے ۔
ان معنوں (انکار کرنا ، نہ ماننا) کے لیے عموماً مفعول بنفسہٖ استعمال نہیں ہوتا یعنی " کفَر اللّٰہ " نہیں کہتے ۔ حتیٰ کہ قرآن کریم میں تین جگہ (البقرہ : ۱۵۲ ، ہود : ۶۰، ۶۸) جہاں یہ فعل صلہ کے بغیر مفعول بنفسہٖ کے ساتھ آیا ہے ۔ مثلاً " کَفَرُوْا رَبَّهُمْ " ۔ تو یہاں " نعمۃ " کا لفظ محذوف مان لیا جاتا ہے ۔ " یعنی کفَروا نعمۃَ ربّھم " مراد ہے ۔ دعائے قنوت میں " وَلَا نَكْفُرُكَ " بھی گویا دراصل " لانکفرُ نِعْمَتَكَ " ہے ۔ اور معنی ہیں " ناشکری یا بے قدری کرنا " ۔

● بنیادی طور پر یہ فعل (کفَر یکفُر) متعدی ہے ۔ تاہم اکثر اس کا مفعول محذوف

کر دیا جاتا ہے ۔(اور قرآن کریم میں یہ استعمال یعنی بغیر ذکر مفعول ' بکثرت ہے۔ جس کی ایک مثال یہی زیرِ مطالعہ آیت ہے) اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ " کافر ہونا ' منکر ہونا " سے بھی کر لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ فعل لازم نہیں ہے۔ دراصل ایسے تمام مواقع (استعمال) پر توحید ' رسالت یا آخرت یا تینوں ہی مفعول محذوف ہوتے ہیں۔ یعنی " ایمانیات " کا انکار کرنا ۔ یا اسلام کے بنیادی عقائد کا انکار مراد ہوتا ہے جس کی اصل " حقیقت پر پردہ ڈالنا " ہی ہے ۔ اس طرح اصطلاحاً " کفر " (کافر ہونا) آمن (ایمان لانا) کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مترجمین نے یہاں " کفروا " کا ترجمہ " کافر ہوئے ' منکر ہوئے ' کافر ہو چکے ' کفر اختیار کیا " سے کیا ہے ۔ بعض نے " (قبولِ اسلام سے) انکار کیا " سے ترجمہ کیا ہے ۔ البتہ جن حضرات نے " کافر ہیں " ترجمہ کیا ہے ۔ یہ اس لحاظ سے درست نہیں کہ اس میں اصل جملہ فعلیہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ مفہوم اور مطلب کے لحاظ سے اگرچہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے ۔

اس فعل ثلاثی مجرّد (کفر) کے تین مصدر استعمال ہوتے ہیں " کُفْرٌ " = انکار کرنا کُفْرَانٌ = ناشکری ، بے قدری کرنا اور " کُفُوْدٌ " (مندرجہ بالا) دونوں معنی کے لئے ۔ یہ تینوں مصادر قرآن کریم میں مستعمل ہوئے ہیں ۔ اس کے علاوہ اس مادہ (کفر) سے بکثرت افعال اور مشتقات قرآن کریم میں آئے ہیں ۔ ان سب کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا ۔ ان شاء اللہ ۔

۲ : ۵ : ۱ (۲) [سَوَآءٌ] کا مادہ " س و ی " اور وزن اصلی " فَعَالٌ " ہے اور شکل اصلی " سَوَايٌ " مگر استعمالی وزن " فَعَاءٌ " رہ جاتا ہے کیونکہ الف ممدودہ کے بعد (خصوصاً آخر پر) آنے والی " ی " یا " و " کو عرب ھمزہ کی آواز میں بدل کر بولتے ہیں ۔ اس مادہ (" س و ی ") سے فعل ثلاثی مجرد یا مزید فیہ کے استعمال کی بات ہم آگے چل کر وہاں کریں گے جہاں اس "مادہ" سے پہلی دفعہ کوئی فعل ہمارے سامنے آئے گا ___ (اور یہ موقع البقرہ : ۲۹ میں آ جائے گا) ۔

" سَوَاءٌ " دراصل فعل ثلاثی مجرّد کا مصدر ہے (جس پر مفصّل بات ابھی

آگے آیت ۲۹ میں ہوگی) اس کے بنیادی معنی تو ہیں "برابری" یا "برابر ہونا"۔ پھر یہ مصدر اسم الفاعل کے معنوں میں (برابر ہونے والا) بطور صفت یا ظرف استعمال ہوتا ہے۔ اور اس طرح اس میں "برابر"، "درمیان"، "ٹھیک درمیان"، "یکساں"، "وسط" یا "مثل" یعنی "ٹھیک ایک جیسے" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً "ثَوْبٌ سَوَاءٌ" = جس کا طول اور عرض برابر ہوں۔ یا "سواءُ النھارِ" دن کا ٹھیک درمیان یعنی دوپہر۔ سواءُ الجبل = پہاڑ کی چوٹی جہاں سے دونوں طرف ڈھلان شروع ہوتی ہے۔ اس قسم کی قرآنی تراکیب میں اس لفظ (سواء) کے استعمال کی ہی مثالیں "سواءُ السبیل"، "سواءُ الجحیم" اور "سواء الصراط" ہیں۔ جن کی وضاحت اپنی اپنی جگہ ہوگی۔ انشاءاللہ تعالےٰ۔

● لفظ "سواء" مصدر ہونے کی بناء پر واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر مؤنث سب کے لیے یکساں رہتا ہے۔ مثلاً "ھُمَا سواءٌ" اور "ھُمْ یا ھُنَّ سواءٌ" کہتے ہیں۔ اگرچہ تثنیہ میں "سواءان" (مذکر مؤنث سب کے لیے) اور جمع میں "اَسْواءٌ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور "سواءٌ" کی غیر قیاسی جمع "سواسِی" اور "سواسیۃ" بھی استعمال ہوتی ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں "سواء" کی جمع کہیں اور کسی طرح نہیں آئی۔ بلکہ جمع کے لیے بھی "سواءٌ" ہی استعمال ہوا ہے (مثلاً آل عمران: ۱۱۳ یا النساء: ۸۹ میں)

[عَلَیْھِم] کے معنی و ترکیب (علی + ھم) پر سورۃ الفاتحہ میں بات ہو چکی ہے۔ (۱: ۶: ۱: (۳))۔ "سَوَاءٌ علیھم" کا بالکل لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "برابر ہے اوپر ان کے"، پھر اسی کو بامحاورہ بنانے کے لیے اس کا ترجمہ "برابر ہے ان کے حق میں"، "ان کو برابر ہے"، "انہیں برابر ہے"، "ان کے لیے برابر ہے"، "یکساں ہے ان پر"، "ان کے حق میں یکساں ہے"، "ان پر یکساں ہے" سے کیا گیا ہے اور بعض نے "علیھم" کا ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ "سواءٌ علیھم" کا ترجمہ صرف "برابر ہے" سے

ہی کر دیا ہے۔ جسے محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے ہی درست قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲:۵ : ۱ (۳) [ءَ اَنْذَرْتَهُمْ] یہ دراصل تین کلمات ہیں " ءَ + اَنْذَرْتَ + هُمْ " اِس میں " ءَ " یا " اَ " (جس کے رسم پر ابھی آگے بحث ہوگی)۔ تو ہمزۂ استفہامیہ ہے اور اس کے معنی " کیا ؟ " ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ دو چیزوں میں برابری بیان کرنے کے لیے لفظ " سواءٌ " کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اسے اصطلاح میں " ھمزۃ التسویہ " (برابر کرنے والا ھمزہ) کہتے ہیں۔ یہ (ھمزۃ التسویہ) عموماً " سواءٌ (برابر ہے) " ، لَا اُبَالِیْ ، (مجھے پروا نہیں) " ، " لَا اَدْرِیْ (میں نہیں جانتا) " اور " لَیْتَ شَعْرِیْ (کاش مجھے پتہ چلتا) " کے بعد آتا ہے۔ [قرآن کریم میں صرف " سواءٌ " اور " اَدْرِیْ " کے ساتھ استعمال ہوا ہے]۔ اور عموماً اس کے بعد ایک جملہ آتا ہے جو (بلحاظ معنی) مصدر کا کام دیتا ہے۔ اس وقت اس (اَ) کا اردو ترجمہ " کیا ؟ " کی بجائے " چاہے " یا " خواہ " سے کیا جاتا ہے۔ اور اردو میں تو اسی " چاہے " یا " خواہ " کی تکرار ہوتی ہے یا اس تکرار کی بجائے درمیان میں ایک " یا " استعمال کرتے ہیں۔ مگر عربی میں دوسرے " چاہے " یا " خواہ " کے لیے " اَمْ " لے آتے ہیں۔ جیسا کہ اسی زیر مطالعہ آیت میں آرہا ہے۔

[اَنْذَرْتَ] کا مادہ " ن ذ ر " اور وزن " اَفْعَلْتَ " ہے۔ اس مادہ (نذر) سے فعل ثلاثی مجرد نَذَرَ یَنْذِرُ نَذْرًا (باب ضرب اور نصر سے) استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی " نذر ماننا " ہیں۔ [عربی زبان کا لفظ " نَذْر " اپنے اصل عربی معنوں کے ساتھ ہی اردو میں متعارف بلکہ متداول اور رائج ہے] اور اس فعل (ثلاثی مجرد) سے قرآن کریم میں فعل ماضی کے صرف تین صیغے [البقرہ : ۲۷۰ ، آل عمران : ۳۵ اور مریم : ۲۶) اور مصدر " نَذْر " دو جگہ (البقرہ : ۲۷۰ اور الدھر : ۷) اور اس کی جمع " نُذُور " ایک جگہ (الحج : ۲۹) آئے ہیں۔ ان کی وضاحت اپنی اپنی جگہ کی جائے گی۔ انشاء اللہ

● "أَنْذَرْتَ" اس مادہ (نذر) سے بابِ افعال کے فعل ماضی معروف کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ اور بابِ افعال ("أَنْذَرَ..... يُنْذِرُ إِنْذَاراً") کے بنیادی معنی تو ہیں "..... کو خبر دینا"، ..... کو بتا دینا"، ..... کو نصیحت کرنا" مگر یہ صرف خوفناک چیز یا بُرے نتائج کے بارے میں وقت سے پہلے "خبر دینا" یا "سمجھا دینا" کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا موزوں ترجمہ (وقت سے پہلے) "خبردار کرنا"، "ہوشیار کرنا"، "وارننگ دینا"، "محتاط کرنا"، اور "خوف دلانا" ہی ہو سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر مترجمین قرآن اس (فعل) کا ترجمہ "ڈرانا" کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض نے اس (فعل) کے بنیادی معنی کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ "نصیحت کرنا" سے بھی کیا ہے۔ مگر اس میں اس فعل کی اصل SENSE (خصوصیت) یعنی "خوف والے معنی" سامنے نہیں آتے۔ اس طرح "أَأَنْذَرْتَ" کا لفظی ترجمہ ہوگا۔ "چاہے/خواہ تو نے ڈرایا، (خوف دلانے کے لیے) سمجھایا"۔

● إِنْذار (جو باب افعال کا مصدر ہے) بنیادی طور پر متعدی "بمفعولین" یعنی دو مفعول کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک مفعول تو وہ ہوتا ہے جس کو ڈرایا یا سمجھایا جائے۔ دوسرا مفعول وہ چیز جس سے ڈرایا جائے۔ یہ دونوں مفعول عموماً بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتے ہیں۔ مثلاً "أَنْذَرْتُه الشيءَ = میں نے اس کو (اس) چیز سے ڈرایا"۔ یا مثلاً قرآن کریم میں ہے: "أَنْذَرْتُكُمْ نَاراً" = "میں نے تم کو آگ سے ڈرایا"۔ کبھی کبھار دوسرے مفعول سے پہلے "با" (ب) کا صلہ بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں۔ "أَنْذَرْتُه بالأمرِ = میں نے اسے معاملہ سے ڈرایا"۔ تاہم قرآن کریم میں کہیں بھی دوسرے مفعول کے ساتھ یہ صلہ (ب) استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ (۱) عموماً دونوں مفعول (بنفسہ) مذکور ہوئے ہیں اور اس کی قرآن کریم میں نو (۹) مثالیں موجود ہیں (الانعام: ۱۳۰، ابراھیم: ۴۴، مریم: ۳۹، الزمر: ۷۱، المؤمن: ۱۸، فصلت: ۱۳، القمر: ۱۳۶، النبأ: ۴۰ اور

اللیل : ۱۴) ۔ (۲) البتّہ زیادہ تر دوسرا مفعول محذوف ہوتا ہے (جو عموماً عذابِ آخرت یا سزائے اعمال وغیرہ ہوتا ہے اور خود بخود سمجھا جاتا ہے) اس (دوسرا مفعول محذوف ہونے) کی بھی کم از کم پچیس (۲۵) مثالیں قرآن میں موجود ہیں ۔ (۳) اور بعض دفعہ پہلا مفعول محذوف کر دیا جاتا ہے (یعنی کفار یا مخاطب وغیرہ) مگر دوسرا مفعول (جس شے سے ڈرانا مقصود ہوتا ہے) مذکور ہوتا ہے قرآن کریم میں اس کی کم از کم تین مثالیں موجود ہیں (الکهف : ۲ ، غافر (المؤمن) : ۱۵ ، اور الشوریٰ : ۷) ــــ (۴) اور بعض جگہ دونوں ہی مفعول محذوف کر دیے گئے ہیں مگر وہ سیاقِ کلام سے سمجھے جا سکتے ہیں مثلاً " قُمْ فَأَنْذِرْ " (المدثر : ۲) " یعنی کھڑا ہو اور ڈرا " یہاں کس کو ڈرا ؟ کس سے ڈرا ؟ مذکور نہیں ہے ۔ اس کی ایک اور مثال (الاعراف :۲) میں ہے ۔ یہ تمام امثلہ اور اس فعل (انذار) سے کچھ مزید افعال اور مشتقات قرآن کریم میں بکثرت وارد ہوئے ہیں ۔ ان سب کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا ــــ یہاں (آیت زیرِ مطالعہ میں) " ءَأَنْذَرْتَهُم " میں ضمیر مفعول " هم " کے بعد دوسرا مفعول (یعنی کس سے ڈرا ؟) محذوف (غیر مذکور) ہے ۔

۲ : ۵ : ۱ (۴) [أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ] جو دراصل أَمْ + لَمْ تُنْذِرْ + هُمْ ہے ۔ " أم " تو یہاں همزة التسویہ کے " جواب " میں ہے (همزة التسویہ پر ابھی اوپر " ءَ " کے ضمن میں بات ہوئی ہے) اس کا اردو ترجمہ " چاہے " ، " خواہ " یا " یا " سے ہی ہوگا ۔ یہ (أَمْ) عموماً همزة التسویہ کے بعد آتا ہے ۔ اس لیے اسے " أَمْ متصلہ " (ساتھ والا) اور " أَمْ معادلہ " (برابری کے معنی دینے والا) بھی کہتے ہیں ــــ بعض دفعہ یہ (أَمْ) همزة التسویہ کے بغیر مستقل جملہ کے شروع میں بھی آتا ہے ۔ اس وقت اسے " أم منقطعہ " کہا جاتا ہے ۔ اس وقت اس کا اردو ترجمہ بطور استفہام " کیا " یا " آیا " کرتے ہیں ۔ اس کی مثالیں بھی آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی ۔

" لم تُنْذِرْ " کا مادہ " ن ذ ر " ہے اور وزن " لم تُفْعِلْ " ہے ۔

یعنی یہ بابِ اِفعال سے فعل مضارع معروف منفی بِلَمْ کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ "اِنْذار" (یعنی اَنْذرَ یُنذِرُ) کے معنی پر ابھی اوپر "اَنذَرْتَ" کے ضمن میں بات ہو چکی ہے۔ اس صیغے (لم تنذر) کا لفظی ترجمہ تو ہو گا "تو نے ڈرایا ہی نہیں"۔ اور "ھُمْ" ضمیر مفعولِ اوّل کے لیے ہے۔ اس طرح "اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ" کا لفظی ترجمہ ہُوا "چاہے / خواہ / یا تو نے ڈرایا ہی نہیں ان کو"۔ یہاں دوسرا مفعول (یعنی کس چیز سے نہ ڈرایا) محذوف یعنی غیر مذکور ہے، جو سیاقِ کلام سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی جو آیت کے شروع میں آنے والے "کفروا" کا مفعول ہے۔ وہی یہاں مراد لیا جا سکتا ہے ـــــ

● عربی زبان میں اس قسم کے "تسویہ" (چاہے ...... چاہے ......) کے بیان کے لیے عموماً دونوں جگہ فعل ماضی استعمال ہوتا ہے۔ لفظاً ہو معناً ـ جیسا کہ آپ یہاں دیکھ رہے ہیں کہ "اَنذَرْتَ" بلحاظ لفظ بھی ماضی ہے جب کہ "لم تُنْذِرْ" بلحاظ معنی ماضی ہے۔ یوں اس حصۂ آیت "ءَ اَنذرتھم اَم لم تُنذِرھم" کا لفظی ترجمہ تو ہو گا: "خواہ ڈرایا تو نے ان کو خواہ/یا ڈرایا ہی نہیں تو نے ان کو" ـــــ اردو محاورے میں ایسے موقع پر عموماً فعل مضارع استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے اردو مترجمین نے اس (حصّہ آیت) کا ترجمہ "تو ان کو ڈراوے یا نہ ڈراوے۔" پھر "ڈراوے" ذرا پرانی اردو ہے اس لیے بعد کے مترجمین نے "ڈرائے یا نہ ڈرائے" استعمال کیا ہے۔ بعض نے ضمیر فاعل واحد مخاطب کا ترجمہ "تو" کی بجائے "تم" اور بعض نے مزید احتراماً "آپ" کیا ہے اور یوں "تم ڈراؤ یا نہ ڈراؤ" اور "آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں" "نصیحت کریں یا نہ کریں" سے ترجمہ کیا گیا ہے ـــــ "اِنذار" کے ان معنوں پر ابھی اوپر بات ہوئی ہے۔

۲:۵:۱(۵) [لَا یُؤْمِنُوْنَ] کا مادہ "ا م ن" اور وزن "لَا یُفْعِلُوْنَ" ہے۔ یعنی یہ اس مادہ (امن) سے باب افعال کا فعل مضارع معروف منفی صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ سیاقِ کلام (جس طرح بات چل رہی ہے) کی بنا پر یہاں

فعل مضارع کا ترجمہ فعل مستقبل کی صورت میں کرنا زیادہ موزوں ہے ۔ یعنی" وہ ایمان نہیں لائیں گے "۔ بعض مترجمین نے " ایمان " کا " کفر " (بمعنی انکار کرنا ۔ نہ ماننا) کی ضد ہونے کی بنا پر اس کا ترجمہ " نہیں مانیں گے " کیا ہے اور بعض نے اردو محاورے کے مطابق نفی کا زور ظاہر کرنے کے لیے اس کا ترجمہ " وہ ایمان لانے کے نہیں" کیا ہے۔ البتہ جن حضرات نے اس کا ترجمہ " وہ تو ایمان لانے والے نہیں " سے کیا ہے وہ محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے درست ہونے کے باوجود اصل عبارت (متن) سے دور جانے والی بات ہے ۔ کیونکہ یہ " لایؤمنون " (جملہ فعلیہ) سے زیادہ" وما ھم بمؤمنین " (جملہ اسمیہ) کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے ۔

۲:۵:۲ الاعراب

" ان الذین کفروا سواء علیھم ءَ أنذرتھم ام لَم تُنذِرھُمْ لایومنون ":

[إِنَّ] حرف مشبہ بالفعل ہے ۔ یہاں (آیت زیرِ مطالعہ میں) اس کا اسم بھی اور خبر بھی جملے ہیں ۔ اور ان کو محلاً ہی منصوب اور مرفوع قرار دیا جا سکتا ہے ۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ [الذین] اسم موصول ہے ۔ اور " إِنَّ " کی وجہ سے منصوب ہے اگرچہ مبنی ہونے کی وجہ سے کوئی علامتِ نصب ظاہر نہیں ہے ۔ [کفروا] یہ جملہ فعلیہ یعنی فعل مع فاعل ہے جس میں ضمیر فاعل " ھو " مستتر ہے ۔ یہ جملہ فعلیہ " الذین " (موصول) کا صلہ ہے اور صلہ موصول مل کر (الذین کفروا) " إِنَّ " کا اسم ہے یعنی محلاً منصوب ہے ۔ [سَوَاءٌ عَلَيھم] کے اعراب (یا ترکیب) کی تین صورتیں ممکن ہیں :

(۱) اسے (سواء علیھم " کو) " إِنَّ " کی خبر بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور مابعد کی عبارت " ءَ أنذرتھم ام لم تنذرھم " کو مصدری معنی کے ساتھ اسی خبر (سواءٌ علیھم) کا ایک حصہ سمجھ لیا جائے یعنی " برابر

ہے ان پر تیرا ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا" اور خود یہ عبارت [ءَ اَنْذرتھم] ایک جملہ ہے جس میں همزۂ تسویہ کا ہے اور " انذرتَ " فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعل " أنتَ " مستتر ہے اور " ھم " ضمیر منصوب متصل مفعول بہ ہے۔ اسی طرح [اَم لم تُنذرھم] بھی ایک جملہ ہے جس میں " اَم " متصلہ جواب همزہ التسویہ ہے۔ " لم تُنذِرْ " فعل مضارع معروف منفی " بِلَمْ " ہے اور اس لیے مجزوم ہے۔ علامتِ جزم " رْ " کا سکون ہے۔ اور آخری " ھم " ضمیر منصوب متصل اس فعل (لَم تُنذِر) کا مفعول بہ ہے۔

(۲) اور یہ بھی جائز ہے کہ اس پوری عبارت (ءَ اَنذرْتَھم اَمْ لَمْ تُنذِرھُمْ) کو مبتداء مؤخر اور " سواءٌ علیھم " کو اس کی خبر مقدم قرار دیا جائے۔ پھر اس سارے جملے (سواءٌ ...... تنذرھم) مبتدأ و خبر ـــ کو " اِنَّ الذین کفروا " کی خبر سمجھا جائے اس صورت میں ترجمہ کی صورت یوں ہو گی " بے شک الذین کفروا (کافروں) کو " ءَ اَنذرتھم ام لم تنذرھم " (تیرا ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا۔ مصدری معنی) " سواء علیھم " (برابر ہے ان پر) ـــــ ان دونوں تراکیب (۱) و (۲) کے لحاظ سے آخری حصۂ آیت [لا یؤمنون] کو جو مضارع معروف منفی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے اور جس میں ضمیر فاعلین " ھم " مستتر ہے ـــ اس (لا یؤمنون) کو " اِنَّ " کی دوسری خبر سمجھا جائے گا۔ اور

(۳) تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ " لا یؤمنون " کو تو " اِنَّ الذین کفروا " کی خبر قرار دیا جائے اور درمیانی عبارت " سواء علیھم ءَ انذرتھم اَم لم تنذرھم " کو جملہ معترضہ سمجھ لیا جائے ۔ تینوں تراکیب کے لحاظ سے اردو ترجمہ میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا سوائے اس کے کہ لفظوں کی تاخیر یا تقدیم کر دی جائے ۔ مذکورہ بالا تین تراکیب کے لحاظ سے ترجمہ یوں ہو گا۔ (اس میں اختصار کے لیے " الذین کفروا " کا ترجمہ " کافروں " کر لیا گیا ہے اور " ءَ انذرتھم ام لم تنذرھم " کے مصدری معنی لیے گئے ہیں)۔

(۱) بے شک " کافروں " پر برابر ہے ۔ " تیرا ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا " ۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے ۔

(۲) بے شک " کافروں " کو " تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا " برابر ہے ۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے ۔

(۳) بے شک کافر لوگ ۔۔۔ چاہے تم ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ۔ برابر ہے ۔۔۔ ایمان نہیں لائیں گے ۔

اکثر مترجمین نے تیسری صورت کے ساتھ ترجمہ کیا ہے ۔

۲ : ۵ : ۳ الرسم

" الذین " کے رسم پر بات ہو چکی ہے الفاتحہ : (۱ : ۶ : ۳) [کفروا] کی واو الجمع کے بعد ایک زائد الف " ا " کا لکھنا رسم عثمانی اور رسم املائی دونوں کی رد سے لازمی ہے ۔ [تاہم رسم عثمانی کے مطابق قرآن کریم میں چار افعال کے ساتھ واو الجمع کے باوجود یہ زائد الف نہیں لکھا جاتا ۔ ان مقامات کا ذکر اپنی جگہ آئے گا] ۔ اور یہ (زائد الف لکھنے کا) قاعدہ ہر واو الجمع کے بارے میں ہے جس کی تین چار صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) ماضی معروف یا مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب مثلاً " قَتَلوا ۔ قُتِلوا " (۲) مضارع (معروف یا مجہول) مجزوم یا منصوب کا صیغہ جمع مذکر غائب یا حاضر مثلاً " لم یُقتَلوا ۔ لن یُقتَلوا ۔ وغیرہ " (۳) فعل امر یا نہی (معروف یا مجہول) کے یہی دو صیغے (جمع مذکر غائب و حاضر) مثلاً " لا تکفروا " وغیرہ میں ۔

● واو الجمع کے بعد اس " الف زائدہ " (جو پڑھا نہیں جاتا) کے لکھنے کی دو تین وجوہ بیان کی گئی ہیں مثلاً

(۱) یہ واو الجمع (جو فعل کے جمع کے بعض صیغوں کے آخر پر آتی ہے) اور واو العطف (بمعنی " اور " والی) میں فرق کرنے اور التباس سے بچنے کے لیے لکھا جاتا ہے ۔ مثلاً اگر صرف " کفرو " لکھا ہو تو بعض جگہ اسے " کَفَرَوَ ...... " پڑھنے

کی غلطی ہو سکتی ہے۔

(۲) ناقص واوی کے صیغہ مضارع معروف صیغہ واحد مذکر غائب (پہلا صیغہ) مثلاً یدعو، یعفو، یمحو وغیرہ سے فرق کرنے کے لیے۔ [اس قسم کے صیغوں کی "واو" کو "الواو المتطرفۃ" یعنی ایک کنارے پر آنے والی "واو" کہتے ہیں] تاہم یہ قاعدہ بھی رسم املائی کی حد تک ہی لازمی ہے۔ رسم قرآنی اس قاعدہ کا پابند نہیں ہے قرآن کریم میں بعض خاص مقامات پر اس قسم کے صیغوں کے ساتھ بھی "زائد الف" لکھا جاتا ہے یعنی "یدعوا، یمحوا" وغیرہ اور بعض ایسے کلمات کے آخر پر بھی "الف زائدہ" لکھا جاتا ہے جہاں عام رسم املائی میں زائد الف لکھنا درست نہیں ہے۔ مثلاً "اولو" کو بھی "اولوا" لکھنا۔

(۳) بعض صورتوں میں "جمع مذکر سالم مرفوع مضاف" اور "صیغۂ فعل" میں فرق کرنے کے لیے ـــــ مثلاً "قاتِلوا المشرکین" (مشرکوں کے قاتل) میں لفظ مضاف (قاتلو) "قاتل کی جمع مذکر سالم ہے"۔ جو دراصل "قاتلون" تھا مگر مضاف ہونے کے باعث اس کا نونِ اعرابی گر گیا اور "قاتلو" ہو کر مضاف ہوا۔ مگر "قاتلوا المشرکین" (اس کے دو الف "ا ا" نوٹ کیجئے) میں "قاتلوا" باب مفاعلہ (مقاتلہ یا قتال) کا فعل ماضی صیغہ جمع مذکر غائب "قاتَلوا" یا فعل امر کا صیغہ جمع حاضر "قاتِلوا" ہو سکتا ہے۔ پہلی صورت میں ترجمہ "وہ مشرکوں سے لڑے" اور دوسری صورت میں "تم مشرکوں سے لڑو"۔ ہوگا۔ اس قسم کے لفظوں میں اس زائد الف کے ذریعے ہی یہ تمیز ممکن ہے۔

ان توجیہات سے آپ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں ـــــ اور عام عربی املاء میں بھی ـــــ حروف زوائد (جو لکھے جاتے ہیں مگر پڑھے نہیں جاتے)۔ اور اس قسم کے اور بھی کئی قسم کے "زوائد" آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گے۔ ـــــ یہ "زوائد" دراصل عربی دان اور صرف و نحو سے واقف آدمی کو غیر مشکول

عبارت میں لفظ کی درست " شکل " کی طرف رہنمائی کرتے ہیں [1]

[سوآءً] اصل مصاحف عثمانیہ میں یہ لفظ " سوا " (بغیر آخری همزہ کے) لکھا گیا تھا ۔ بلکہ ان مصاحف میں جہاں بھی همزہ متطرفہ (کسی کلمہ کے آخر پر آنے والا همزہ) اگر کسی حرفِ ساکن کے بعد آتا تھا' اسے لکھنے میں حذف کر دیا گیا تھا ۔ همزہ ابتدائیہ ۔ وصل کا ہو یا قطع کا — ہمیشہ بصورتِ الف اور همزہ متوسطہ (کلمہ کے درمیان میں آنے والا همزہ) حسب موقع " الف " یا " و " یا " ی " کی صورت میں لکھا گیا تھا ۔ مثلاً " بأس " کو " باس " ، " بؤس " کو " بوس " ، (قرآن کریم میں لفظ " بؤس " کہیں نہیں آیا اس کی بجائے مثال " مُؤمن " کو " مومن " لکھنے کی سمجھ لیجئے) اور " بِئس " کو " بس " لکھا گیا تھا ۔ اور اس کی وجہ یہ بھی کہ بعض اہلِ زبان (مثلاً اہلِ حجاز) تو اس قسم کے همزہ کا تلفظ ہی نہیں کرتے تھے ۔ اور جو قبائل اس قسم کے ہمزہ کا تلفظ کرتے تھے وہ اپنی زباندانی کی بناء پر سمجھ جاتے تھے کہ یہاں همزہ " موجود " ہے ۔ اس قسم کے همزہ کے تلفظ میں اختلاف کی بھی یہی وجہ ہے ۔

● بعد میں (قریباً پہلی صدی ہجری کے آخر پر) جب علاماتِ ضبط — ایجاد ہوئیں تو همزہ کے لیے بھی علامت مقرر کی گئی ۔ شروع میں یہ علامت زرد ، سرخ یا سبز رنگ کا گول نقطہ ہوتا تھا — اور بعض افریقی ملکوں میں اب تک اس کا رواج چلا آتا ہے — دوسری صدی ہجری کے اواخر میں الخلیل الفراهیدی نے حرف " عین " کے سرے (ء) کو همزہ (القطع) کی علامت مقرر کیا [2] اس وقت سے آج تک همزہ کی یہ صورت اکثر اسلامی ممالک میں رائج ہے ۔ قرآن کریم کی کتابت میں بھی اور عام عربی املاء میں بھی ۔ بعض ممالک میں " ء " کی بجائے E ، S ، ع ، ٥ وغیرہ بھی مستعمل ہیں ۔

---

[1] " شکل " کے معنی ہیں کسی لفظ کے ہر ہر حرف پر حرکت دینا ۔ اور ایسے الفاظ کو " مشکول " کہتے ہیں مثلاً " مُبَشِّرٌ " یا " مَدِيْنَة " وغیرہ ۔

[2] جسے بعض اہلِ علم " عین بتراء " (دُم کٹی عین) بھی کہتے ہیں اور بعض متاخرین علماء نے اس کے لیے " مَجْبُوده " (گھنڈی) کی اصطلاح استعمال کی ہے (مثلاً صاحب نثر المرجان)

[ءَ اَنْذَرْتَهم] یہ لفظ بھی مصاحفِ عثمانیہ میں " انذرتھم " یعنی ابتدائی همزۂ کے حذف کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ کیونکہ یہ همزۂ استفہام ہے اور عثمانی مصاحف میں یہ قاعدہ ملحوظ رکھا گیا تھا کہ جہاں بھی همزۂ استفہام کے فوراً بعد همزۂ قطع یا همزۃ الوصل سے شروع ہونے والا (اسم یا فعل) آتا تو اس سے پہلے همزۂ استفہام کتابت میں محذوف کر دیا جاتا۔

● بعد میں جب علامتِ همزہ ایجاد ہوئی تو وہ اس محذوف همزہ کی جگہ لکھی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس لفظ سے پہلے دونوں همزہ (همزہ استفہام اور همزۂ قطع) بصورت الف نہیں لکھے جاتے یعنی اسے " أأنذرتھم " کی بجائے "ءَ أَنذرتھم" کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ تاکہ معلوم رہے کہ رسمِ عثمانی میں یہ ابتدائی همزہ (استفہام) نہیں لکھا گیا تھا۔ ورنہ عام عربی املاء میں اسے " أأنذرتھم " لکھنا بالکل درست ہے [دوسرے لفظوں میں رسمِ عثمانی پر ایک الف " ا " کا اضافہ بھی جائز نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ ایک نبرہ (دندانہ) کی کمی بیشی بھی جائز نہیں۔ جیسا کہ آگے اس کی مثالیں بھی ہمارے سامنے آئیں گی]۔

[أم لم تنذرھم] اور [لا یؤمنون] کی املاء عام رسمِ معتاد کے مطابق ہی ہے۔

۲:۵:۴ الضبط

(ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون)

آیت زیرِ مطالعہ میں اختلاف ضبط کی حسب ذیل صورتیں موجود ہیں:-

(۱) همزۃ الوصل کے علامت ڈالنا یا نہ ڈالنا اور ڈالنے کی صورت میں اس علامت کی شکل (صہ ، ہ) کا فرق۔ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ یہ " علامتِ الوصل " صرف عرب اور افریقی ملکوں کے مصاحف میں ڈالی جاتی ہے مشرقی ممالک میں اس کا رواج

نہیں ہے ۔بہرحال اس اختلاف کا اثر کلمہ " الـذین "کے ضبط میں ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) ھمزۃ القطع میں علامت قطع کا ڈالنا یا ڈالنا اور ڈالنے کی صورت میں اس کی صورت کا اختلاف ۔ کسی کلمہ کے ابتداء میں آنے والے ھمزۃ القطع (جو ہمیشہ بصورت " الف " ہی لکھا جاتا ہے) پر مشرقی ممالک میں علامت قطع نہیں ڈالی جاتی ۔ درمیان میں یا آخر پر آنے والے ھمزۃ القطع کے لیے علامتِ قطع تمام ملکوں میں ڈالی جاتی ہے البتہ اس کی شکل وصورت میں فرق ہے (ء، E ، ى یا ٥ (زرد گول نقطہ) ۔اس اختلاف کا اثر کلمات "إِنَّ " ، سواء ، " ءَانذَرْتَهُم اور " أم " اور " لا يؤمنونَ " کے ضبط میں ظاہر ہوگا ۔

(۳) واو ساکنہ ماقبل مضموم پر علامت سکون ڈالنے کا رواج صرف برصغیر میں ہے ۔ اس کا نمونہ " کفروا " اور " لایومنون "کے ضبط میں سامنے آئے گا ۔

(۴) یائے ساکنہ ماقبل مکسور پر علامت سکون ڈالنے کا رواج بھی صرف برِصغیر میں ہے اور اس ماقبل پر علامت کسرہ (ـِ) کی بجائے علامتِ اشباع ۔ کھڑی زیر (ـٖ) ڈالنے کا رواج صرف ترکی اور ایران میں ہے ۔اس کا نمونہ آپ " الـذین " کے ضبط میں دیکھیں گے ۔

(۵) الف (ساکنہ) کے ماقبل پر فتحہ (ـَ) کی بجائے علامتِ اشباع ۔ کھڑی زبر۔ (ـٰ) ڈالنے کا رواج صرف ایران میں ہے اس کا نمونہ یہاں " سوآءٌ " اور " لا " کے ضبط میں دیکھیں گے ۔

(۶) واو الجمع کے بعد آنے والے الف زائدہ پر علامتِ زیادۃ (تنسیخ) ڈالنے کا رواج صرف افریقی اور عرب ملکوں کے مصاحف میں ہے ۔ یہ علامت عموماً چھوٹا سا لمبوترہ " دائرہ " ہوتا ہے (٥) ۔ اس فرق کو آپ " کفروا "کے ضبط میں دیکھیں گے

(۷) نونِ مخفاۃ (ساکنہ) کو علامتِ سکون سے معری رکھنے کا رواج بھی صرف عرب اور افریقی ملکوں میں ہے ۔ برِصغیر، چین ، ایران اور ترکی میں اس کا رواج نہیں البتہ بعض علاقوں (مثلاً چین) میں اور بعض مصاحف (ایڈیشنوں) کے اندر نون ساکن

کے اس اخفاء کو بعض دیگر طریقوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً چین میں ایسے نون پر علامت سکون کے ساتھ تین ہلکے نقطے ڈال دیتے ہیں۔ مصحف حلبی (مطبوعہ قاہرہ، مصر) اور تجویدی قرآن (مطبوعہ پاکستان) میں نون ساکنہ مخفاۃ کے لیے ایک خاص علامتِ سکون (ہ، ہ) وضع کی گئی ہے۔ ضبط کے اس فرق کو آپ کلمات "انذرتھم" اور "تنذرھم" میں دیکھیں گے۔

(۸) تنوین اظہار کے لیے الگ متراکب حرکات کا استعمال بھی صرف عرب اور افریقی ممالک میں ہوتا ہے یا پاکستانی تجویدی قرآن میں اسے اپنایا گیا ہے ــــ تمام مشرقی ممالک میں تنوین ــــ اخفاء ہو یا اظہار ــــ کے لیے یکساں علامت تنوین استعمال ہوتی ہے۔ اس اختلاف کا اثر کلمہ "سواء" کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

(۹) نونِ متطرفہ (آخر پر آنے والے نون) پر علامتِ اعجام (نقطہ) نہ ڈالنے کا رواج صرف افریقی مصاحف میں نظر آتا ہے۔ اس اختلاف کا اثر "الذین" اور "لایؤمنون" کے ضبط میں دیکھیں گے۔

(۱۰) "راء" (ر) کی ترقیق یا تفخیم کا لحاظ رکھتے ہوئے (از روئے قواعد تجوید) راءِ مفخمہ کے لیے "ر" اور رائے مرققہ کے لیے "ر" کا استعمال صرف تجویدی قرآن (پاکستانی) میں کیا گیا ہے۔ اس کا نمونہ آپ کو "کفروا"، "أنذرتھم" اور لم تنذرھم" میں ملے گا۔

اس طرح مجموعی طور پر آیت زیرِ مطالعہ کے کلمات میں اختلافِ ضبط کی حسبِ ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں ــــ ملاحظہ کیجئے کہ اصل رسمِ عثمانی تمام کلمات کا یکساں ہی رہتا ہے:

إِنَّ ، إِنَّ ، إِنَّ ، إِنَّ

الَّذِينَ ، الَّذِينَ ، الَّذِينَ ، الَّذِينَ

كَفَرُوا ، كَفَرُوا ، كَفَرُوا

سَوَآءٌ ، سَوَآءٌ ، سَوَآءٌ ، سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ
ءَاَنْذَرْتَهُمْ ، ءَأَنْذَرْتَهُمْ ، ءَآنْذَرْتَهُمْ
وَانْذَرْتَهُمْ اَمْ ، أَمْ ، اَمْ
لَمْ تُنْذِرْهُمْ ، لَمْ تُنْذِرْهُمْ ، لَمْ تُنْذِرْهُمْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ، لَا يُؤْمِنُوْنَ ، لَا يُؤْمِنُوْنَ ،
لَا يُؤْمِنُوْنَ

بقیہ : ھدایت القرآن

ہوتا اور اگر کیا تھا تو پہلے اس کی خلاف ورزی نہ کی جاتی۔ ہر حساس آدمی کو ایسے موقع پر بڑی بے چینی ہوتی ہے اور صحابہ کرامؓ تو شریعت کے معاملہ میں بڑے حساس تھے۔ اللہ نے اس موقع پر جو انداز اختیار کیا ہے وہ بھی سمجھانے کا ہے کہ تمہیں ایسا نہ کرنا چاہیے۔ خیر اب جو کچھ ہو گیا وہ ہو گیا۔

۲ آیت میں ایک بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ عبادت اور روزہ جیسی عبادت بھی اپنا فائدہ کھو دیتی ہے، اگر ایک دوسرے کے حق کی حفاظت نہ کی گئی، زیادتی و حق تلفی سے بچا نہ گیا، حرام آمدنی و کمائی سے اپنے کو محفوظ نہ کیا گیا۔ درمیان میں یہ آیت اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ آیت میں ان مذہبی سرمایہ داروں کے لیے بھی بڑی تنبیہ ہے جو روزہ تو رکھ لیتے ہیں اور حج پر حج کرتے رہتے ہیں یا کراتے رہتے ہیں لیکن ان سے غریبوں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں، ان پر زیادتی اور انکی حق تلفی کرتے ہیں، حرام آمدنی اور کمائی سے نہیں بچتے ہیں۔ ایسے لوگ روزہ اور حج دونوں کے فائدہ سے محروم رہتے ہیں۔ یہ آیت روزہ اور حج کے احکام کے درمیان میں ہے۔ اس کے بعد حج کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ دار اور حاجی دونوں کو تنبیہ مقصود ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری مذہبی زندگی "معاملات کی درستگی" سے خالی ہو گئی ہے، حالانکہ عبادات و معاملات دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ہیں۔ اگر معاملات کو الگ کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ عبادات بے معنی ہو جاتی ہیں بلکہ پورا اسلام ایک "کھلونا" بن کر رہ جاتا ہے۔

"کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے"

کراچی میں 'قرآن اکیڈمی' کا قیام اور شام الہدیٰ کا انعقاد

مرتّب : رحیم کاشفی

دعوت رجوع الی القرآن کی پیش رفت پر مبنی ایک رپورتاژ

ملک کے سب سے بڑے صنعتی اور ساحلی شہر کراچی میں ۲۶ر جنوری کے سی او پی کے نقیدالمثال جلسے اور ۲۹ ر جنوری سے شروع ہونے والے تبلیغی جماعت کے سہ روزہ عظیم الشان اجتماع سے قبل اسی عروس البلاد میں دو ایسی تقریبات ہوئیں جو عددی لحاظ سے تو ان دونوں کے پاسنگ کہلانے کی بھی حقدار نہیں لیکن فکری لحاظ سے "خدایان سیاست اور پیران کلیسا" دونوں کے لئے قطب نما کا درجہ رکھتی ہیں۔ آئندہ سطور میں انہی تقریبات کی مختصر سی روداد پیش کی جارہی ہے۔

۲۳ ر جنوری کو ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ہال روم میں منعقد ہونے والی پہلی تقریب ہر لحاظ سے منفرد حیثیت کی حامل تھی۔ جس میں شہر کے چیدہ چیدہ اہل فکر و شعور خواتین و حضرات مدعو تھے۔ خواتین کے لئے علیحدہ نشستوں کا باپردہ انتظام تھا۔ اس تقریب باسعید کا اہتمام انجمن خدام القرآن سندھ کراچی کی جانب سے کیا گیا تھا۔ انجمن کے قیام کا مقصد منبع ایمان و سرچشمہ یقین یعنی قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے اور اعلیٰ علمی سطح پر تشہیر و اشاعت ہے تاکہ امت مسلمہ میں تجدید ایمان کی عمومی تحریک کے ذریعے اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور غلبۂ دین حق کے دور ثانی کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انجمن کے پروگرام میں عربی زبان کی تعلیم و ترویج، قرآن مجید کے مطالعہ کی عام تشویق و ترغیب، علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت، تعلیم و تعلّم قرآن کو مقصد زندگی بنا لینے والے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اور ایک ایسی قرآن اکیڈمی کا قیام شامل ہے جو قرآن کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر پیش کر سکے۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد جو کہ انجمن کے نگران اعلیٰ بھی ہیں۔ انجمن خدّام القرآن سندھ نے ساحل سمندر پر واقع درخشاں سوسائٹی کلفٹن میں ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کی جانب سے عطا کردہ تین ہزار مربع گز کے ایک بڑے پلاٹ پر جامع القرآن (مسجد) اور قرآن اکیڈمی کی تعمیر کا آغاز کر دیا ہے

پچھتر لاکھ روپے کے تخمینہ کا یہ منصوبہ اپنے ابتدائی مراحل سے گزر چکا ہے اور بنیادوں تک کا کام پورا کر لیا گیا ہے، بقایا تعمیر شرمندۂ تعبیر ہے۔ لہٰذا دینی و ملّی جذبہ وشعور رکھنے والے متموّل اور صاحبِ خیر افراد کی توجّہ اس جانب مبذول کرانے کے لئے انہیں تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی تاکہ کام کی اہمیت و افادیت ان پر واضح ہو اور وہ انشراحِ صدر کے ساتھ اس کارِ تاریخ ساز میں تعاون کریں۔ مادر علمی کی بنیاد دراصل تعمیر معاشرہ اور جہانِ نو کی ابتداء ہے۔

ملّت اسلامیہ پاکستان اس وقت جن مخدوش حالات سے دوچار ہے ان کی سنگینی کا احساس ہر باشعور پاکستانی مسلمان کو ہے لہٰذا ہر شخص سوچ رہا ہے کہ اس کیفیت سے نجات کی کوئی راہ ہے یا نہیں اور ہے تو کونسی ؟ اس موضوع پر خطاب کے لئے دعوت دی گئی تھی مفکر قرآن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو۔ مختصر اور منتخب اصحاب فکر و نظر کے اجلاس کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے ہوا۔ اور انجمن کے وجیہہ و شکیل جوان سال صدر زین العابدین جوّاد کے تشکّر آمیز خیر مقدمی و تعارفی کلمات کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے خطاب فرمایا تقدیر و تدبیر کی چاشنی سے مرکب اس خطاب کا خلاصہ ذیل کی سطور میں پیش کیا جا رہا ہے :

خطبۂ مسنونہ کے بعد انہوں نے فرمایا کہ اس وقت ہم قومی و ملّی سطح پر جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کا تجزیہ ٹائمز آف لندن کے ایک اداریہ کے حوالے سے کفایت کرے گا جو اس نے ہمارے اکتالیسویں یوم استقلال پر شائع کیا تھا۔ مدیر ٹائمز کے مطابق تقسیم ہند کے موقع پر اس کے پیشرو مدیر نے تجزیہ کرتے ہوئے پاکستان کے مستقبل کو انتہائی تابناک اور بھارت کے مستقبل کو تاریک قرار دیا تھا کہ بھارت مختلف النوع نسلوں، قومیتوں اور مذاہب کا وطن ہے جس میں وحدت کا کوئی عنصر نظر نہیں آتا جب کہ اہلِ پاکستان کو متحد کرنے والی ایک قوت مذہب کی طاقت کی شکل میں موجود ہے۔ لیکن مدیر ٹائمز کے مطابق آج معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ پاکستان نہ صرف دولخت ہو چکا ہے بلکہ اس کا مستقبل بھی مخدوش نظر آتا ہے ! ۔ سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا !

ہمارا قومی وجود ایک نکتہ لاینحل (Dilemma) ہے یہ ایک ایسا ملک ہے جس کی مذہب کے علاوہ کوئی بنیاد نہیں ہے۔ لیکن مذہب سے جو تعلق ابتدا میں تھا اس میں بھی بتدریج کمی آتی چلی جا رہی ہے۔ جب کہ صرف نظریاتی قوت ہی اسے متحد رکھ سکتی ہے۔ عام طور پر عالمی سطح پر بھی یہی کہا جاتا ہے کہ پاکستان مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا تھا بلکہ ساتھ ہی بالکل غلط طور پر اسرائیل کا نام بھی لیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد بھی مذہب پر قائم ہے۔ لیکن اسرائیل کا معاملہ جدا ہے جو کہ ایک نسل پرستانہ ریاست ہے۔ البتہ مختلف حلقوں کی طرف سے یہ رائے بھی سامنے آئی کہ پاکستان ہرگز مذہب کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا بلکہ اس کے وجود میں آنے کے اصل اسباب خالص سیاسی تھے یا خالص

معاشی۔ نہ صرف حسین شہید سہروردی بلکہ نورالامین صاحب نے بھی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان خالص معاشی اسباب کی بنا پر قائم ہوا تھا۔ اسی طرح میاں ممتاز دولتانہ نے تحریکِ پاکستان کو خالص سیاسی قرار دیا تھا اور بعد ازیں سردار شوکت حیات خاں نے فرمایا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کا نعرہ ہر گز کوئی سنجیدہ اور سوچی سمجھی بات نہیں تھی بلکہ یہ تو چند چھوکروں نے ایجاد کیا تھا۔ یہ سارے مغالطہ آمیز خیالات دراصل شاخسانہ ہیں اسلام کو بطور سیاسی نعرہ کے استعمال کرنے کا جسے اولاً حزب اختلاف نے اختیار کیا اور بعد ازیں گیارہ سال تک ایوان حکومت سے یہی نعرہ لگتا رہا۔ لیکن اس پیچیدہ مسئلے کے حل کی کہ پاکستانی کے قیام کی بنیاد کیا تھی، آسان صورت زمین پر پانی کی تین سطحوں کی تمثیل سے سامنے آتی ہے جیسا کہ پانی کی ایک سطح زمین پر دریاؤں اور ندی نالوں کی صورت میں نظر آتی ہے اور دوسری ۴۰ تا ۸۰ فیٹ کی وہ سطح ہے جہاں سے کنویں اور ہینڈ پمپوں وغیرہ سے پانی نکالا جاتا ہے۔ جب کہ تیسری سطح کئی سو فٹ کی گہرائی پر ہے جہاں سے نیوب ویل کے ذریعے پینے کا صاف و شفاف پانی حاصل ہوتا ہے۔ بعینہ پاکستان کے تکوین و ایجاد (Genesis) کے بھی تین سطحیں ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانان ہند کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے والا نعرہ بہر صورت "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" ہی تھا خواہ اس کے الفاظ بزرگوں نے متعین کئے تھے یا نوجوانوں نے۔ پھر قائد اعظم نے برملا اور واضح و غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کی قومیت کی اساس مذہب کو اور پاکستان کی منزل اسلام کو قرار دیا تھا۔ دوسری سطح پر اگر تحریک پاکستان کے اصل جذبہ محرکہ کو تلاش کریں تو یہاں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔ لیکن میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ تحریک پاکستان کا اصل جذبہ محرکہ مذہبی نہیں تھا۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ تحریک کی اصل قیادت معروف معنوں میں ہر گز مذہبی لوگوں پر مشتمل نہ تھی کیونکہ کسی تحریک کے جذبہ محرکہ کا سب سے زیادہ نمایاں صورت میں اس کی قیادت میں نظر آنا لازم ہے۔ میرے نزدیک تحریک پاکستان کا اصل جذبہ محرکہ نہ مذہبی تھا نہ محدود معنی میں معاشی و سیاسی بلکہ وہ ایک قومی جذبہ تھا جو ہندوؤں کی طرف سے سیاسی و معاشی اور سماجی و معاشرتی سطح پر حق تلفی کے اندیشہ سے وجود میں آیا تھا۔ اب تیسری سطح پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قوم کی قومیت کی بنیاد کیا تھی جسے یہ اندیشہ لاحق تھا، تو محالہ اس کا جواب یہی ملے گا کہ برعظیم کے مسلمان ہر گز نسل، زبان اور طرز رہن سہن کی بنیاد پر ایک قوم نہیں تھے، ان کو ایک قوم بنانے والی کوئی قدر مشترک تھی تو صرف ایک یعنی مذہب! یعنی پاکستان کی اصل اساس سوائے دین و مذہب کے کوئی اور نہیں ہے۔ اور آج بھی ملت اسلامیہ پاکستان کو ایک قوم بنانے والا کوئی عامل ماسوائے مذہب کے کوئی نہیں، نہ اسے تاریخی تقدس (Sanctity) حاصل ہے جیسے چین، جاپان، مصر اور دیگر ممالک وغیرہ جو ہزاروں سال سے موجود ہیں۔ پاکستان کا تو لفظ بھی نصف صدی قبل تک کسی لغت

میں موجود نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پاکستان بلا تردد بنگلہ دیش بن گیا ورنہ اس وقت دنیا میں دو جرمنی، دو کوریا دو یمن بھی موجود ہیں اور کوئی ملک بھی اپنا نام ترک کرنے کو گوارا نہیں کرتا۔ اسی طرح نہ جغرافیائی عامل ہماری پشت پر ہے جو تقویت دے سکتا اور نہ ہی قومیت کو وجود میں لانے کے لئے نسل و زبان ہی ہمارے لئے بنیاد بن سکتا ہے۔ اسی طرح وطنی قومیت بھی موثر قوم پرستی (Nationalism) کی صورت اختیار نہیں کر سکتی کیونکہ پاکستان تو خود وطنی قومیت کی نفی کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا تھا۔ ہمارے لئے بس مذہبی جذبہ ہی ہے جس نے پاکستان کو جنم دیا تھا اور جو اس کے استحکام کے لئے پختہ اساس اور سنگین بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔ لیکن وہ مذہبی جذبہ جو اب پاکستان کے استحکام کی حقیقی اور مضبوط پائیدار بنیاد بن سکتا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے قطعاً مختلف ہے اس مذہبی جذبہ سے جس نے پاکستان کو جنم دیا تھا۔ اب نسلی و وراثتی نہیں بلکہ حقیقی و عملی اسلام کی ضرورت ہے۔ ورنہ آج ہماری ۹۵ فیصد اکثریت کا اسلام سے تعلق کا اندازہ اس حدیث نبوی کی روشنی میں لگایا جا سکتا ہے جس میں نماز کو کفر و ایمان کے درمیان حدِّ فاصل قرار دیا گیا ہے۔ اور کچھ لوگ جو مذہبی دائرے میں نظر بھی آتے ہیں تو ان کا تعلق بھی نہ صرف محدود ہے بلکہ مسخ شدہ بھی، انہیں حرام و حلال سے کوئی غرض نہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی ہیں جو دین کا مطالعہ کرتے ہیں اور فہم بھی رکھتے ہیں لیکن خود کچھ کرنے کو تیار نہیں اور دین کے تقاضوں سے کنی کتراتے ہیں۔ اور جو طبقہ دین پر عمل پیرا ہے بھی تو وہاں اختلافات کا طومار ہے۔ عوام کا اسلام کے عملی اقدار کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں اور کم و بیش یہی حال خواص کا بھی ہے۔ علماء بھی پیشہ ور ہیں وہ بھی تنخواہ اور گریڈ کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں، ان کی جماعتیں بھی ٹریڈ یونین ازم کی مصداق ہیں۔ ان سب کے باوجود کچھ آسمانی و غیبی اشارات ہیں کہ جن سے ڈھارس بندھتی ہے اور امید کی کرن نظر آتی ہے۔ فرمان رسولؐ ہے کہ: اسلام پورے کرہ ارضی پر غالب ہو کر رہے گا خواہ کسی سعادت مند کو عزت دے کر یا کسی بدبخت کو ذلیل و رسوا کر کے۔ اور فرمایا کہ میرے لئے کل زمین کو لپیٹ دیا گیا چنانچہ میں نے اس کے مغارب و مشارق کو دیکھ لیا اور یقیناً میری امت کی حکومت اس زمین پر قائم ہو کر رہے گی جو میرے لئے لپیٹی گئی۔

تجدید و احیائے دین کی تحریکوں اور مساعی کا محور و مرکز بھی گذشتہ چار سو سال سے یہی خطہ رہا ہے۔ الف ثانیؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور بعد ازیں شاہ ولی اللہؒ، تحریک شہیدینؒ، اسی طرح ماضی قریب میں شیخ الہندؒ کی تحریک، تحریک جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کی تحریک اس کی اعلیٰ مثالیں ہیں اسی طرح دعوت رجوع الی القرآن کا غلغلہ بھی یہیں بلند ہوتا رہا۔ آزادی کی تحریکوں میں یہ واحد خطہ ہے جہاں اسلام کا نعرہ بلند کیا گیا جب کہ کسی اور ملک میں اسلام کے نام پر آزادی کی تحریک نہیں چلائی گئی اور اس ملک کا قیام بھی دراصل مشیتِ ایزدی و تائید و نصرت الٰہی کا مظہر

ہے جو تاریخ کے آئینہ میں کیبنٹ مشن پلان، ایوب خانی دور میں مشترکہ دفاع کی پیش کش اور ۱۹۷۱ء میں اپنی دفاعی صلاحیت کے حوالے سے دیکھی جا سکتی ہے۔

لہٰذا حالات اس کے متقاضی ہیں کہ عوامی سطح پر توبہ کی ایک تحریک برپا ہو اور دین ہمارے کردار و اقدار، اخلاق و اعمال میں نظر آنے لگے، ایمان ہمارا قال ہی نہیں حال بن جائے لیکن وہ ایمان حاصل ہو گا منبع ایمان و سرچشمہ یقین قرآن حکیم سے۔ جسے مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے بڑے پیارے پیرائے میں ایک شعر میں بیان کیا ہے۔ ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی قاری کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ وہ اہم باتوں کو مختلف اسلوب سے بیان کرتا ہے تاکہ ہر سطح کا ذہن مستفیض ہو سکے لیکن کوئی عوامی تحریک نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک اس کی پشت پر ذہین اقلیت موجود نہ ہو۔ جب تک یہ ذہین طبقہ نہیں بدلتا معاشرہ نہیں بدلے گا اس کے فکر و شعور میں ایمان پیدا نہیں ہو گا تو معاشرہ کوئی تبدیلی قبول نہیں کرے گا۔ آج ضرورت ہے کہ قرآن کو ذہنوں میں اتارا جائے۔ اس کی بنیاد پر جماعت سازی ہو اور اسی کی اساس پر تحریک برپا کی جائے۔ اسلامی جمہوریت بھی بغیر انقلاب کے نہیں آئے گی۔ وقتی ہنگامے کے نتیجہ میں تو آمریت ہی قائم ہو گی لیکن آج ہماری اکثر دینی جماعتیں سیاسی عناصر کے ہاتھوں استعمال ہو رہی ہیں۔ پاکستان کے بقا و استحکام کا کوئی امکان نہیں سوائے اسلام کے لیکن حقیقی و واقعی اسلام جو دلوں میں گہری جڑیں رکھتا ہو۔ اسی مقصد کے لئے قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ جو دعوت رجوع الی القرآن کی راہ کا سنگ میل ہے۔

شام الہدیٰ: ۲۴ر جنوری کو مقامی آڈیٹوریم میں.....

انجمن خدّام القرآن سندھ کی جانب سے منعقد ہونے والی دوسری روح پرور تقریب "شام الہدیٰ" کا موضوعِ خطاب تھا: "علمائے کرام اور دینی جماعتوں کا اہم ترین فریضہ، نہی عن المنکر"۔ کراچی میں اس روحانی اجتماع کا انعقاد اکتوبر ۱۹۸۴ء سے تسلسل اور وقفوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے جس کے مستقل اور واحد مقرر انجمن کے نگران اعلیٰ اور امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ہیں اور جس میں ہر طبقۂ زندگی کے افراد کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔

دعوت رجوع الی القرآن کے سلسلے میں "عوامی درس قرآن" کی جس خواہش کا اظہار حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے اسارت مالٹا سے واپسی پر کیا تھا یہ تقریبات دراصل اسی کی کڑی ہیں۔ آڈیٹوریم اور پبلک ہال کا انتخاب بھی اسی مقصد کے پیش نظر کیا جاتا ہے تاکہ مختلف طبقات تک قرآن کا پیغام پہنچ جائے۔ ہال کے دروازے پر استقبال کرنے والے رضا کاروں نے نہی عن

المنکر سے متعلق آیات و احادیث پر مشتمل ایک دو ورقہ بھی تقسیم کیا تاکہ دوران خطاب ریفرنس پر نظر رہے۔

تقریب کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے ہوا اور انجمن کے نئے صدر نے نپے تلے الفاظ میں ٹھہر ٹھہر کر انجمن کا تعارف پیش کیا۔ بعد ازیں ڈاکٹر صاحب موصوف نے خطاب کا آغاز خطبۂ مسنونہ اور تلاوت قرآن و حدیث سے کیا۔ خطاب کا خلاصہ درج ذیل ہے :۔

جس طرح ہر ادارہ اور اجتماعی ہیئت کے اغراض و مقاصد طے کئے جاتے ہیں ایسے ہی امت جس کے معنی ہی ہم مقصد لوگوں کی اجتماعیت ہے، کی بھی کوئی غرض و غایت ہے جس پر اکثر و بیشتر ہم نے غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ امت کی غرض تاسیس دو اصطلاحات سے سمجھی جا سکتی ہے ایک فلسفیانہ ہے اور دوسری عام فہم اور آسان۔ قرآن کی ایک اصطلاح ہے شہادت علی الناس یعنی قول و فعل و عمل سے گواہی دینا اور یہی انبیاء کرام کا مقصدِ بعثت بھی تھا تاکہ وہ حجت قائم کر دیں اور ختم نبوت کے نتیجے میں اب یہ ذمہ داری اُمّت محمدؐ پر آ گئی ہے جیسا کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں نبی اکرمؐ نے فرمایا فلیبلغ الشاھد الغائب کہ جو موجود ہے وہ پہنچائے انہیں جو حاضر نہیں ہیں۔ لہٰذا اب اُمّت اس کے لئے مسئول و جواب دہ (Accountable) ہے۔ شہادت علی الناس ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے لیکن قرآن تو عام و خواص دونوں طرح کے افراد کی رہنمائی کرتا ہے۔ دوسری آسان اصطلاح ہے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" نیکی کی تلقین کرنا اور برائیوں سے روکنا۔ بھلائی اور خیر خواہی کرنا اور ظلم و ستم سے بچانا۔ لیکن امت اپنا مقصد فراموش کر بیٹھی ہے۔ اس نے دیگر اقوام کی طرح خود بھی قوم کا روپ دھار لیا ہے جو بھاگ دوڑ غیر مسلموں کی ہے وہی اس اُمّت کی بھی۔ اجتماعی سطح پر جو مقاصد دوسروں کے ہیں وہی اس کے بھی ہیں۔ اُمّت میں ایک اُمّت کے پیدا ہونے کی ضرورت ہے جو خود بھی جاگیں دوسروں کو بھی جگائیں، اپنی ذمہ داری کا احساس کریں۔ آج دنیا میں ایک ارب سے زائد مسلمان ہیں لیکن خواب غفلت میں مدہوش ہیں۔ جو اس فرض کو ادا کریں گے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

بدقسمتی سے انتہائی نیک، متقی اور دین کی محنت کرنے والوں میں بھی یہ مغالطہ پیدا ہو گیا ہے کہ صرف نیکی کا پرچار کیا جائے بدی سے روکنے کی ضرورت نہیں ہے یعنی نیکی پھیلے گی تو برائی از خود ختم ہو جائے گی بعض اعتبارات سے یہ بات بڑی وزنی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نیّت پر شبہ نہیں لیکن قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر دونوں کا ذکر کیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم و ملزوم ہیں۔ ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ایک تصویر کے دو رخ ہیں۔ نعوذ باللہ قرآن میں نہی عن المنکر کا حکم صرف شاعری تو نہیں ہے۔ صرف نیکی کی تلقین سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی جوابی کارروائی اور کشمکش تو برائیوں سے روکنے پر ہوگی۔

از روئے قرآن امر بالمعروف و نہی عن المنکر شانِ باری تعالیٰ ہے، تقاضائے فطرت و حکمت ہے، کار نبوت ہے، شان صحابہؓ ہے، امت کا فرض منصبی ہے، اصحابِ اقتدار کا فرض عین ہے، سرفروش اور جانباز اہل ایمان کے اوصاف کا ذروۂ سنام ہے اور اس کے برعکس نیکی سے روکنا اور بدی کی تلقین کرنا منافقین کا طرز عمل ہے۔ دراصل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لاینفک (Inseperable) ہیں اور ان دونوں میں بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں اہم تر نہی عن المنکر ہے۔ بنی اسرائیل پر لعنت کی وجہ یہی بیان فرمائی گئی کہ وہ برائیوں سے نہیں روکتے تھے۔ آج ہمارے ہاں مذہبی معاملات پر تو مناظرے ہوتے ہیں لیکن منکرات کے خلاف خاموشی ہے۔ ہماری دینی جماعتیں اپنے اصل ہدف سے ہٹ گئی ہیں اور پاور پالی ٹیکس میں ملوّث ہو کر ادھر ادھر لڑھک رہی ہیں بلکہ سیاسی عناصر کے مقاصد کی تکمیل میں لگی ہوئی ہیں۔ اُن کی دوستیاں انہی کے ساتھ ہیں اس معاملہ میں شریعت کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہے بلکہ بس ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔

برائی کے خلاف منظم جد و جہد کی ضرورت ہے تاکہ طاقت کے ذریعے اس کا سر کچل دیا جائے۔ ایسے تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تنظیم قائم ہو جن کی اپنی زندگی میں حرام و حلال کی پابندی ہو رہی ہو اور جو براہ راست تصادم مول لے سکتے ہوں۔ سُنّی مسلمانوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ اصحابِ اقتدار کے خلاف بغاوت نہیں ہو سکتی خواہ وہ فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہوں جب تک وہ کفرِ بواح کا حکم نہ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ مکتب فکر کے تحت تو تحریکیں اٹھی ہیں لیکن پوری سنی دنیا سُن پڑی ہوئی ہے۔ روس کی حالت سامنے ہے جہاں آذربائی جان میں شیعہ افراد نے علم بغاوت بلند کیا لیکن سنی ریاستیں خاموش ہیں اور وہاں آزادی کی کوئی لہر نہیں اٹھی۔ دراصل یہ مغالطہ بعض وجوہات کی بنا پر سنی مسلمانوں میں پروان چڑھا جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ تاہم امام ابو حنیفہ ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فاسق و فاجر حکمران کے خلاف بغاوت ہو سکتی ہے بشرطیکہ طاقت اتنی ہو کہ کامیابی یقینی ہو جائے۔ بہر صورت ہماری نجات برائی سے روکتے رہنے میں ہے لوگ مانیں نہ مانیں ہمیں یہ فریضہ ادا کرتے رہنا ہے یہی عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

LEARN & TEACH QURAN

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۵)

ڈاکٹر محمد مقصود

دُنیا کے مختلف نظاموں کا ایک جائزہ!

آیئے اسلامی دنیا کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظاموں پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں۔

سیاسی سطح پر:- جیسا کہ گذشتہ صفحات میں واضح ہو چکا ہے کہ سیاسی سطح پر آخری فیصلہ دینے اور جائز و ناجائز کے سلسلے میں قانون بنانے کا سارا اختیار اللہ تعالےٰ کے پاس ہے۔ مگر اسلامی دنیا نے لومڑی جیسی چالاکی کے ساتھ یہ اختیار اللہ تعالےٰ سے غصب کر لیا ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو مسلمانوں کا خود اپنا چھچھورپن اور شُتر گربگی ہے اور دوسری وجہ یورپ یا مغرب کی ذہنی و فکری اور جسمانی و بدنی اندھا دھند بندگی، نقالی اور غلامی ہے۔

ے جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلا تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے

یا پھر یہ کہ

ے اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

اور مزید یہ کہ

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

از روئے قرآن امر بالمعروف و نہی عن المنکر شانِ باری تعالیٰ ہے، تقاضائے فطرت و حکمت ہے، کار نبوت ہے، شان صحابہؓ ہے، امت کا فرض منصبی ہے، اصحابِ اقتدار کا فرض عین ہے، سرفروش اور جانباز اہل ایمان کے اوصاف کا ذروۂ سنام ہے اور اس کے برعکس نیکی سے روکنا اور بدی کی تلقین کرنا منافقین کا طرز عمل ہے۔ دراصل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لاینفک (Inseperable) ہیں اور ان دونوں میں بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں اہم تر نہی عن المنکر ہے۔ بنی اسرائیل پر لعنت کی وجہ یہی بیان فرمائی گئی کہ وہ برائیوں سے نہیں روکتے تھے۔ آج ہمارے ہاں مذہبی معاملات پر تو مناظرے ہوتے ہیں لیکن منکرات کے خلاف خاموشی ہے۔ ہماری دینی جماعتیں اپنے اصل ہدف سے ہٹ گئی ہیں اور پاور پالی ٹیکس میں ملوث ہو کر ادھر ادھر لڑھک رہی ہیں بلکہ سیاسی عناصر کے مقاصد کی تکمیل میں لگی ہوئی ہیں۔ اُن کی دوستیاں انہی کے ساتھ ہیں اس معاملہ میں شریعت کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہے بلکہ بس ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔

برائی کے خلاف منظم جد و جہد کی ضرورت ہے تاکہ طاقت کے ذریعے اس کا سر کچل دیا جائے۔ ایسے تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تنظیم قائم ہو جن کی اپنی زندگی میں حرام و حلال کی پابندی ہو رہی ہو اور جو براہ راست تصادم مول لے سکتے ہوں۔ سُنی مسلمانوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ اصحابِ اقتدار کے خلاف بغاوت نہیں ہو سکتی خواہ وہ فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہوں جب تک وہ کفرِ بواح کا حکم نہ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ مکتب فکر کے تحت تو تحریکیں اٹھی ہیں لیکن پوری سنی دنیا سُن پڑی ہوئی ہے۔ روس کی حالت سامنے ہے جہاں آذربائی جان میں شیعہ افراد نے علم بغاوت بلند کیا لیکن سنی ریاستیں خاموش ہیں اور وہاں آزادی کی کوئی لہر نہیں اٹھی۔ دراصل یہ مغالطہ بعض وجوہات کی بنا پر سنی مسلمانوں میں پروان چڑھا جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ تاہم امام ابو حنیفہ ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فاسق و فاجر حکمران کے خلاف بغاوت ہو سکتی ہے بشرطیکہ طاقت اتنی ہو کہ کامیابی یقینی ہو جائے۔ بہر صورت ہماری نجات برائی سے روکتے رہنے میں ہے لوگ مانیں نہ مانیں ہمیں یہ فریضہ ادا کرتے رہنا ہے یہی عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

LEARN & TEACH QURAN

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۵)

ڈاکٹر محمد مقصود

دُنیا کے مختلف نظاموں کا ایک جائزہ!

آیئے اسلامی دنیا کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظاموں پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں۔

سیاسی سطح پر: جیسا کہ گذشتہ صفحات میں واضح ہو چکا ہے کہ سیاسی سطح پر آخری فیصلہ دینے اور جائز و ناجائز کے سلسلے میں قانون بنانے کا سارا اختیار اللہ تعالےٰ کے پاس ہے۔ مگر اسلامی دنیا نے لومڑی جیسی چالاکی کے ساتھ یہ اختیار اللہ تعالےٰ سے غصب کر لیا ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو مسلمانوں کا خود اپنا چھچھورپن اور شتر گربگی ہے اور دوسری وجہ یورپ یا مغرب کی ذہنی و فکری اور جسمانی و بدنی اندھا دھند بندگی، نقالی اور غلامی ہے۔

ے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلا تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے

یا پھر یہ کہ

ے
اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

اور مزید یہ کہ

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

چنانچہ آج تک کوئی دلیل اس امر کی پیش نہیں کی جاسکتی کہ اسلامی دنیا کے عدالتی ججوں اور وکیلوں نے قرآن وسنّت کو بنیاد بنا کر اپنے فیصلے صادر کئے ہوں۔ فیصلے تو خیر بڑی دور کی بات ہے قدم قدم پر یہ "خود ساختہ خدا" قرآن وسنت کے فیصلوں کے خلاف سینہ تان کر مخالفتوں پر اتر آتے ہیں۔ خود پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ میں عدالتوں کے ایسے جج گزرے ہیں اور موجود ہیں جو قرآن کے ساتھ سنت کی شرعی حیثیت کے تو سرے سے قائل ہی نہیں۔ بخاریؒ اور مسلمؒ اُن کے نزدیک بڑے کودن اور احمق تھے۔ اور اُن کی بیان کردہ احادیث چند من گھڑت قصوں سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اور پھر اک طرفہ تماشا یہ ہے کہ ایسی عدالتیں "اسلامی عدالتیں" اور ایسے جج "اسلامی جج" کہلائے جا رہے ہیں۔ پس یہ سمجھنا قطعاً غلط ہے کہ اسلامی دنیا کے کسی ملک میں سیاسی سطح پر حاکمیتِ خداوندی کا سکہ چل رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں حاکمیتِ انسانی کا کھوٹا سکہ رواں دواں ہے۔ حاکمیتِ خداوندی کے عملاً قیام کی رٹ جس مردِ مومن نے بھی لگائی اُسے اس ناقابلِ معافی جرم کی پاداش میں یا تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ٹھونس دیا گیا یا پھر اُنہیں پھانسی کے تنگ و تاریک کنویں کی راہ دکھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندگی سے محروم کر دیا گیا۔ چنانچہ مصر میں جب بیسیوں کتابوں کے مصنّف اور عظیم الشان تفسیر قرآن " فی ظلال القرآن" کے مؤلف سید قطبؒ شہید نے حاکمیتِ خداوندی کے قیام کا نعرۂ مستانہ بلند کیا تو وہاں "اسلامی عدالت" کے "اسلامی جج" اور "اسلامی جیل" کے "اسلامی منتظمین" کیسی کچھ درندگی اور حیوانیت کے ساتھ اِس مردِ خدا (سید قطبؒ) پر ٹوٹ پڑے اور پھر جیل کے اندر اس مظلوم کے ساتھ ان "اسلامی شیطانوں" نے "اسلامی شیطانیت" کی کیسی کیسی ہولیاں کھیلیں، وہ خود ذرا ان کے ایک شاگردِ رشید یوسف العظم کی زبانی سنئے۔

"فوجی افسر جب سید قطبؒ کو گرفتار کرنے کے لیے اُن کے گھر میں داخل ہوئے تو سید اُس وقت انتہائی شدید بخار میں مبتلا تھے۔ انہیں اسی حالت میں زنجیروں میں جکڑ لیا گیا اور پیدل جیل تک لے جایا گیا۔ جیل کے دروازے پر اُن کی ملاقات جیل کے کمانڈر حمزہ بسیونی اور خفیہ پولیس کے افسروں سے ہوئی۔ جوں ہی سیّد قطبؒ نے جیل کے اندر قدم

رکھا تو جیل کے کارندے ان پر ٹوٹ پڑے اور پورے دو گھنٹے تک اُن کو زدوکوب کرتے رہے ۔ جیل کے اندر ان پر ایک سدھایا ہوا گرگ نما فوجی کتا بھی چھوڑا گیا جو ان کی ران کو منہ میں لے کر ادھر اُدھر گھسیٹتا رہا ۔ ان پر گوناگوں اذیتوں کی بارش ہوتی رہی مگر وہ " اللہ اکبر" اور " وللہِ الحمد" کے سرورِ جاودانی میں مستغرق رہے ۔ انہیں آگ سے داغا گیا ۔ پولیس کے کتوں نے انہیں کچلیوں میں لیکر گھسیٹا ۔ ان کے سر پر کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈا پانی انڈیلا گیا ۔ لاتوں اور گھونسوں سے مارا گیا ، جس کی بدولت ان کی جسمانی طاقت تقریباً ختم ہو چکی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ قلبی حرارت اور اطمینان وصبر کی طاقت نے ہمت و عزیمت کے اس علمبردار کو ایک مضبوط چٹان میں تبدیل کر دیا تھا ۔ ۲۴ اگست ۱۹۶۶ء کو پھانسی کے کنویں میں اپنی جان ، جاں آفریں کے سپرد کر دی "۔

اسی طرح مصر ہی کے اندر اسلامی تحریک " الاخوان المسلمون" کے بانی اور حاکمیت خداوندی کے بالفعل غلبے اور بالادستی کے شیدائی امام حسن البنّاءؒ شہید کو چند " اسلامی قانون" نے دن دہاڑے گولی مار کر نہ صرف شہید کر دیا بلکہ اُس وقت کی " اسلامی حکومت" نے خود شہید کے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی ان کے جنازے میں شرکت سے بزور روک دیا ۔ چنانچہ جنازے کو خود کاندھا دے کر چلتے چلتے شہید کی بڑی بیٹی کے منہ سے جو حسرت آمیز صدائیں نکلیں وہ تاریخ کے ماتھے پر ایک بدنما جھومر ہے ۔ ان الفاظ کو محسن محمد کی ایک عربی کتاب " مَنْ قَتَلَ حَسَنَ البنّاء" سے سنئے ۔

" ابا جان آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں ۔ ہم آپ کے پیغام کا حق ادا کرنے میں سستی نہیں دکھائیں گے ۔ حکومت نے لوگوں کو آپ کے جنازے میں شمولیت سے بزور روک دیا ہے ۔ افسوس ان حکام کی سنگدلی اور حماقت پر ۔ ۔ ۔ ۔ ابا جان آپ کے جنازے میں لوگوں کا ہجوم نہیں مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ شہداء کا قافلہ جنازے کے ساتھ ہے ' اُن کی روحیں ہمیں تسلی دے رہی ہیں ' دنیا والوں کو اندھی طاقت نے روک دیا ہے تو آسمان والے ہمارے ساتھ ہیں "

پس ان تصریحات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ بشمول پاکستان پوری اسلامی دنیا کے اندر سیاسی سطح پر نہ صرف یہ کہ اللہ کی حاکمیت عملاً قائم نہیں دستور یا آئین میں

بے شک معاشرے کے ایک رسمی اسلامیت کے دباؤ کے تحت لکھا ہوا ہو) بلکہ حاکمیتِ خداوندی کے راستے کے پتھر بڑے بڑے ظالم وجبّار خداوند بنے بیٹھے ہیں۔

معاشی سطح پر:۔ یہاں پر تو شاید کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہو کہ اسلامی دنیا اور خود اپنی مملکتِ خداداد پاکستان کے اندر ایک بے خدا اور ظالمانہ سودی نظام نے ہمارا بال بال جکڑ رکھا ہے۔ کسی ادارے کا افسرِ بالا، کسی مدرسے کا مدرّسِ اعلیٰ، کسی دارالعلوم کا مفتیِ اعظم اور کسی خانقاہ کا مرکزی اس نظامِ خبیث کی خباثتوں سے بچا ہوا نہیں۔ بلکہ دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو ہمارے وجود پر پڑے ہوئے کپڑوں کا ایک ایک ریشہ، ہمارے سامانِ خورد و نوش کا ایک ایک قطرہ اور دانہ اور ہمارے بود و باش کے مکانوں اور دیواروں کا ایک ایک ٹکڑا سُود در سُود کے بندھنوں میں چار و ناچار بندھا ہوا ہے۔ اس نظامِ غلیظ کی ضلالتوں سے اگر کوئی چیز بچی ہوئی ہے تو وہ شاید قبر کی دو گز زمین کا وہ خطۂ پرسوز ہے جس کے لیے قبر میں پڑا ہوا ایک حساس مردہ اقبالؔ کے بقول اللہ کے سامنے شکر و امتنان کی آہ بھرتا ہے۔

ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس
ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانہ آباد
اللہ ترا شکر کہ یہ خطۂ پُرسوز
سودا گرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

چنانچہ معلوم ہوا کہ معاشی سطح پر بھی ہمارے ملک اور پوری اسلامی دنیا کا رویہ اللہ اور رسولؐ کے خلاف جنگ اور بغاوت پر مبنی ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

پروگرام سالانہ اجتماع تنظیم اسلامی

★ آغاز: ۱۹ مارچ بعد نمازِ عصر

○ خطبۂ استقبالیہ: ڈاکٹر عبدالخالق (ناظمِ اعلیٰ) ○ ہدایات: جناب عبدالرزاق (ناظمِ اجتماع)

★ ۲۰ تا ۳۰ مارچ روزانہ نماز فجر جامع القرآن، قرآن اکیڈمی

میں ادا کی جائے گی اور اس کے بعد مختصر درس قرآن ہوگا جو حسب ذیل رفقاء دیں گے:

○ جناب اسد الرحمٰن (کراچی) ○ ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی (ملتان)
○ ڈاکٹر عارف رشید (لاہور) ○ حافظ مقصود احمد (پشاور)

★ ۲۰ تا ۲۲ مارچ روزانہ ۸½ بجے صبح تا ایک بجے دوپہر قرآن آڈیٹوریم

میں اجلاس ہوں گے جن میں ضروری تنظیمی امور کی انجام دہی کے علاوہ امیر تنظیم، مرکزی شعبہ جات کے ناظمین، اور حسب ذیل حضرات دعوتی اور تربیتی موضوعات پر خطاب فرمائینگے:

○ سراج الحق سیّد (کراچی) ○ مختار حسین فاروقی (جھنگ)
○ ڈاکٹر عبدالسمیع (فیصل آباد) ○ شمس الحق اعوان (وزیر آباد)
○ پروفیسر غازی احمد (میانی، چکوال) اور ○ مولانا فیض الرحمٰن (اسلام آباد)

★ جمعرات ۲۲ مارچ کو بعد نماز مغرب

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کا الوداعی خطاب ہوگا۔

یہ تنظیم کی دعوت، طریقِ کار، اور اس کے مزاج کو سمجھنے کا سنہری موقع ہے!

(نوٹ (۱) تمام اجلاس کھلے ہیں (۲) خواتین کی شرکت کا مناسب اہتمام ہے!)

MARCH 1990 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 9
NO. 3

ماہنامہ میثاق کے ۶۸-۱۹۶۷ء کے اداریوں پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک اہم تالیف:

اسلام اور پاکستان

جسے بجا طور پر تحریکِ پاکستان کے تاریخی و سیاسی پس منظر اور اسلامیانِ پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر پر ایک جامع و مربوط دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

نیا ایڈیشن، نئی خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

قیمت: اعلیٰ ایڈیشن (مجلد) -/۴۰ روپے اشاعتِ عام: -/۱۵ روپے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور